الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

دیوار کو ایک ہی دھکے میں نہیں گرایا جاسکتا
ایسی کوشش کا مطلب صرف ایک ہے ——
دیوار تو نہ گرے البتہ اپنا سر ٹوٹ جائے

قیمت فی پرچہ —— تین ۳ روپے

الرسالہ

دسمبر ۱۹۸۱
شمارہ ۶۱

جمعیۃ بلڈنگ، قاسم جان اسٹریٹ، دھلی ۶ (انڈیا)

تذکیر القرآن

تذکیر القرآن کی اشاعت کا کام الرسالہ اگست ۷۹ ۱۹ میں شروع کیا گیا تھا۔ اب خدا کے فضل سے اس کے دس پارے مکمل ہو گئے ہیں، سورہ فاتحہ سے سورہ توبہ تک اس کی پہلی جلد انشاء اللہ عنقریب شائع کی جائے گی۔

مزید تفصیلات کے لئے آئندہ اعلان ملاحظہ فرمائیں۔

زرتعاون سالانہ ۳۶ روپیہ • خصوصی تعاون سالانہ دوسو روپے • بیرونی ممالک سے ۲۰ ڈالر امریکی

توحید اور مساوات

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کا پیغام دو لفظوں میں یہ تھا ـــــــ توحید اور مساوات ۔ یعنی خدا کو ایک ماننا، اور تمام انسانوں کو برابر سمجھنا۔ آپ نے بتایا کہ اس دنیا کو بنانے والا ایک ہی خدا ہے، وہی سب کو پال رہا ہے اور اسی کے سامنے زندگی کا حساب دینے کے لئے سب کو حاضر ہونا ہے۔

توحید

خدا ایک ایسی کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اس کو مانے بغیر چارہ نہیں۔ انسان کی فطرت اور چاروں طرف پھیلی ہوئی کائنات دونوں پکار پکار کر کہہ رہے ہیں کہ خدا کو ضرور مانا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی مصیبت کا لمحہ آتا ہے تو ہر آدمی کو خدا یاد آجاتا ہے۔ خدا کا انکار کرنے والے بھی نازک وقتوں میں خدا کو پکارنے لگتے ہیں۔ تاریخ کا کوئی ایسا دور نہیں ہے جب کہ لوگ عمومی پیمانہ پر خدا کے منکر بن گئے ہوں۔ تاہم خدا کو ماننے کے باوجود ہر دور میں دو خاص غلطیاں پائی جاتی رہی ہیں۔

۱۔ مظاہر کائنات کو خدا سمجھ لینا۔

۲۔ دکھائی دینے والی چیزوں پر نہ دکھائی دینے والے خدا کو قیاس کرنا۔

آدمی کے اندر اپنے خالق کا تصور نہایت گہرائی کے ساتھ بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے دل میں جذبہ اٹھتا ہے کہ وہ اپنے خالق کو مانے، وہ اس کے ساتھ اپنے کو جوڑے۔ آدمی اگرچہ خدا کو نہیں دیکھتا۔ مگر وہ خدا کی مخلوقات کو دیکھتا ہے۔ یہاں آدمی نے یہ کیا کہ اس نے دکھائی دینے والی چیزوں میں جو چیز نمایاں اور برتر نظر آئی اس کو خدا فرض کر لیا۔ مثلاً سورج، چاند، ستارے، وغیرہ۔ اس نے اصولی طور پر خدا کے وجود کو مانا۔ مگر اس نے اس طرح مانا کہ جو چیز خدا نہیں تھی اس کو محض اپنی اپج کی بنا پر خدا بنا لیا۔

دوسرے لوگوں نے کائناتی مظاہر کو خدا نہیں کہا۔ مگر انھوں نے اسی سے ملتی جلتی ایک اور غلطی کی۔ انھوں نے نظر آنے والی چیزوں پر اس خدا کو قیاس کر لیا جو آنکھوں سے نظر نہیں آتا۔ مثلاً دنیا میں ہر چیز کئی کئی ہوتی ہے۔ انھوں نے خدا کو بھی کئی مان لیا۔ دنیا میں بڑے لوگوں کے کچھ قریبی اور سفارشی ہوتے ہیں۔ انھوں نے خدا کے یہاں بھی بہت سے مقرب اور سفارشی فرض کر لئے۔ انسان بیٹے بیٹیاں رکھتا ہے۔ انھوں نے خدا کے لئے بھی گمان کر لیا کہ اس کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔ وہ خالق کو مان کر اس کو مخلوق کی سطح پر اتار لائے۔

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کے عقیدہ کو اس قسم کی ملاوٹوں سے پاک کیا۔ اور اس کو خالص توحید کی صورت میں انسان کے سامنے پیش کیا۔ قرآن میں حکم ہوا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ وہ اللہ ایک ہے۔

اللہ بے نیاز ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے نہ وہ کسی کی اولاد ہے۔ کوئی بھی اس کا ہمسر نہیں (سورہ اخلاص)

مساوات

انسان نے خود اپنے معاملہ میں بھی وہی غلطی کی جو اس نے خدا کے معاملہ میں کی تھی۔ اس نے دیکھا کہ انسانوں میں کوئی مال دار ہے اور کوئی غریب، کوئی سفید ہے اور کوئی کالا، کوئی اونچے گھرانے کا ہے اور کوئی معمولی گھرانے کا۔ ان فرقوں کی بنا پر لوگوں نے آدمیوں میں فرق کرنا شروع کر دیا۔ انھیں بنیادوں پر ایک انسان اور دوسرے انسان کے درمیان اونچ نیچ قائم ہوگئی۔

پیغمبر اسلام نے بتایا کہ اس طرح کے فرق حقیقی نہیں ہیں، وہ محض ظاہری اور اعتباری ہیں۔ ان کا انسانی اونچ نیچ سے کوئی تعلق نہیں۔ ان فرقوں کے باوجود تمام انسان برابر ہیں۔ سب ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں۔ کسی کو کسی دوسرے کے اوپر رنگ اور نسل اور عہدہ اور مال کی بنا پر بڑائی حاصل نہیں۔ بڑائی کا معیار آدمی کا کردار ہے نہ کہ اس کی ظاہری حیثیت۔ بڑا حقیقت میں وہ ہے جو خدا کا فرماں بردار ہے، چھوٹا وہ ہے جو خدا کا فرماں بردار نہیں۔

قرآن میں کہا گیا ہے کہ اے لوگو، خدا نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمھارے کنبے اور قبیلے بنا دئے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے زیادہ خدا سے ڈرنے والا ہے۔ بے شک اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبر رکھنے والا ہے (الحجرات ۱۳)

پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حج (۱۰ھ) کے خطبہ میں اعلان کیا:

یا ایھا الناس الا ان ربکم واحد، لا فضل لعربی علیٰ عجمی ولا لعجمی علیٰ عربی ولا لاسود علیٰ احمر ولا لاحمر علی اسود الا بالتقوی، ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ الناس من آدم و آدم من تراب

اے لوگو، سن لو تمھارا رب ایک ہے، کسی عربی کو کسی غیر عربی پر یا کسی غیر عربی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر اور کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت ہے۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے۔

اسلام یہ بتاتا ہے کہ جس طرح خدا ایک ہے اسی طرح تمام انسان بھی ایک ہیں۔ فرق یہ ہے کہ خدا کی وحدت اپنی ذات کے اعتبار سے ہے اور انسان کی وحدت اپنی تخلیق کے اعتبار سے۔

جنت والے

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ اہل ایمان کو جس جنت میں داخل کیا جائے گا اس کی معرفت انھیں اسی دنیا میں کرائی جا چکی ہوگی (ویدخلھم الجنۃ عرفھا لھم، محمد) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ جنت کا رزق اس رزق کے مشابہ ہوگا جس کی توفیق انھیں دنیا کی زندگی میں ملی تھی (واتوا بہ متشابھا، بقرہ) حدیث میں کہا گیا ہے کہ جنت و دوزخ دراصل انسان ہی کے اعمال ہیں جو آدمی کی طرف لوٹائے جاتے ہیں (انما ھی اعمالکم ترد الیکم)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت میں داخلہ کا آغاز اسی دنیا سے ہو جاتا ہے۔ جنتی انسان اپنی جنت کو اسی دنیا میں پالیتا ہے۔ گویا کہ جنت کا ایک مثنی اسی دنیا میں ہے اور آخرت کی جنت میں وہی شخص جائے گا جس نے دنیا میں جنت کے اس مثنی کو پالیا ہو۔ جنت کا یہ دنیوی مثنی گویا نقد انعام ہے جو اصل انعام سے پہلے اس کی ایک ابتدائی علامت کے طور پر دے دیا جاتا ہے۔

یہ جنتی کون ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا میں ان کیفیات کا تجربہ کیا ہو جو آخرت میں اس کو جنت کا مستحق بنانے والی ہیں۔ جس کے رونگٹے کھڑے ہو کر اس کو خدائی محاسبہ کا احساس دلا چکے ہوں۔ جس کے قلب پر ٹکڑے کر دینے والی تجلیات کے نزول نے اس کو قربت خداوندی سے آشنا کیا ہو۔ جس نے بغض و انتقام کے جذبات کو اپنے اندر کچل کر عفو خداوندی کا مشاہدہ کیا ہو۔ جس نے اپنے ندامت کے آنسوؤں میں وہ منظر دیکھا ہو جب کہ ایک مہربان آقا اپنے خادم کے اعتراف قصور پر اس سے درگزر فرماتا ہے۔ جس پر یہ لمحہ گزرا ہو کہ ایک شخص پر قابو پانے کے باوجود وہ اس کو اس لئے چھوڑ دے کہ اس کا خدا بھی اس دن اسے چھوڑ دے جب کہ وہ اس سے زیادہ عجز کی حالت میں ہوگا۔ جو ایک امر حق کے آگے اس طرح گر پڑے جیسے لوگ آخرت میں خدا کو دیکھ کر ڈھ پڑیں گے۔

حقیقت یہ ہے کہ مومن جنت کا ایک پھول ہے۔ وہ موجودہ دنیا میں آنے والی دنیا کا ایک ابتدائی شگوفہ ہے۔ مومن پر وہ سارے تجربات اسی دنیا میں گزر جاتے ہیں جو دوسروں پر موت کے بعد گزرنے والے ہیں۔ آدمی کی زندگی میں مختلف قسم کے جو حالات پیش آتے ہیں انھیں میں ہر آدمی کی جنت اور جہنم چھپی ہوئی ہوتی ہے۔ ان حالات میں شیطانی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور ملکوتی ردعمل پیش کر کے کوئی شخص جنت کا۔

شرک خفی

"اور جب اکیلے اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل کڑھنے لگتے ہیں جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اور جب اس کے سوا دوسروں کا ذکر ہوتا ہے تو یکایک وہ خوش ہو جاتے ہیں" زمر — ۴۵

آلوسی بغدادی نے اس آیت کی تفسیر میں اپنا ایک ذاتی واقعہ بیان کیا ہے۔ انھوں نے دیکھا کہ ایک شخص اپنی کسی مصیبت میں ایک مرے ہوئے بزرگ کو پکار رہا ہے۔ انھوں نے کہا، اے شخص! خدا کو پکار۔ وہ خود فرماتا ہے کہ واذا سألك عبادي عني فاني قريب اجيب دعوة الداع اذا دعان (بقرہ) ان کی یہ بات سن کر آدمی سخت غصہ میں آگیا۔ بعد کو لوگوں نے انھیں بتایا کہ وہ کہتا تھا کہ "آلوسی اولیاء کے منکر ہیں"۔ کچھ لوگوں نے اس کو یہ کہتے ہوئے بھی سنا کہ اللہ کی نسبت ولی جلد سن لیتے ہیں۔

یہ ذہنیت کبھی کھلی کھلی غیر اللہ پر اعتماد کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس کو شرک جلی کہا جاتا ہے۔ کبھی یہ ذہنیت شرک خفی کی صورت میں ہوتی ہے جس کو آج کل کی زبان میں شخصیت پرستی کہا جا سکتا ہے۔ آپ کثرت سے ایسے مذہبی حلقے پائیں گے جہاں بظاہر "اللہ اللہ" کا ورد ہوتا ہے اور قرآن پڑھا پڑھایا جاتا ہے، لیکن اگر وہاں کی مجلسوں میں خدا کی باتوں کا چرچا کیجئے تو لوگوں کو کوئی خاص دلچسپی نہیں ہوگی۔ اس کے برعکس اپنی پسندیدہ شخصیتوں کے چرچے رات دن ہوتے رہتے ہیں اور اس سے ان کی دلچسپی کبھی ختم نہیں ہوتی۔

اکثر حالات میں شرک خفی، شرک جلی سے بھی زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ بظاہر برا نہ دکھائی دینے کی وجہ سے اکثر لوگ اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو شرک جلی کے خلاف لسانی اور قلمی جہاد ہی کو اپنا مشغلہ بنائے ہوئے ہیں۔

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان سب سے زیادہ اللہ سے محبت کرنے والے ہوتے ہیں (البقرہ ۱۶۵) دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے کہ ہدایت یافتہ وہ ہے جو اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے (التوبہ ۱۸) اس سے معلوم ہوا کہ توحید یہ ہے کہ شدید محبت اور شدید خوف کا تعلق صرف ایک اللہ سے ہو جائے۔ اس کے مقابلہ میں شرک یہ ہے کہ آدمی اپنی شدید محبت اور اپنے شدید خوف کا مرکز اللہ کے سوا کسی اور کو بنالے، خواہ وہ کوئی زندہ ہو یا مردہ۔

اس معیار پر جانچئے تو معلوم ہوگا کہ بہت سے لوگ جو اپنے کو شرک سے محفوظ سمجھتے ہیں وہ دراصل کچھ علامات شرک سے محفوظ ہیں نہ کہ فی الواقع حقیقت شرک سے۔

عمل کا فرق

ایک ایسا کمپوٹر بنایا جاسکتا ہے جو اپنی صورت کے اعتبار سے بالکل انسان کی طرح دکھائی دیتا ہو۔ اس سے آپ کہیں کہ "پانی لاؤ" اور وہ چل کر مقررہ مقام پر جائے اور وہاں سے پانی کا گلاس لاکر آپ کو پیش کردے۔ مگر کمپوٹر کے اس عمل پر اس کے لئے کوئی جزا نہیں ہے۔

دوسری طرف ایک انسان ہے۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ پیاس سے بیتاب ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر اسے رحم آگیا۔ وہ روانہ ہوا کہ ٹھنڈا پانی لاکر اس پیاسے آدمی کو پلائے۔ اس وقت اس کے دل میں جذبات کا طوفان برپا تھا۔ اس کی زبان سے نکلا: خدایا تو اس دن مجھے ٹھنڈا پانی پلا جس دن تیرے سوا کسی کے پاس پانی نہ ہوگا۔ اس دن مجھ کو اپنے سایہ میں لے لے جس دن تیرے سوا کسی کے لئے سایہ نہ ہوگا۔ اس نے ٹھنڈے پانی کا گلاس لیا اور اس کو لے کر پیاسے کے پاس اس حال میں آیا کہ ایک طرف بھرے ہوئے پانی سے گلاس چھلک رہا تھا۔ اور دوسری طرف خدا کے خوف سے آنسوؤں کا طوفان اس کی آنکھوں میں امڈ رہا تھا۔ عین ممکن ہے کہ آدمی کا یہ عمل اللہ کو اتنا زیادہ پسند آجائے کہ اسی عمل پر اس کی بخشش ہو جائے۔

کمپوٹر اور انسان میں یہ فرق کیوں ہے۔ جو کام انسان نے کیا وہی کام کمپوٹر نے بھی کیا۔ مگر انسان کو ایک گلاس پانی کے بدلے جنت دے دی گئی۔ جب کہ کمپوٹر کو اسی قسم کے ایک گلاس پانی پر کوئی انعام نہیں ملا۔ اس کی وجہ جذبہ کا فرق ہے۔ کمپوٹر کا عمل بے شعوری کی سطح پر تھا اور انسان کا عمل شعور کی سطح پر۔ کمپوٹر نے بے حسی کے تحت اپنا کام انجام دیا اور انسان نے احساس کے تحت۔ اسی فرق کا یہ نتیجہ تھا کہ ایک کو اپنے کام پر کوئی جزا نہیں ملی اور دوسرے کو اسی عمل پر ابدی جنت لکھ دی گئی۔

یہی وہ فرق ہے جس کو شریعت میں قساوت اور احتساب کے الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔ قساوت کا مطلب ہے بے حسی۔ اس سے مراد وہ عمل ہے جو محض ظاہری اعضاء سے انجام دیا جائے۔ جس میں انسان کی اپنی نفسیات شامل نہ ہو۔ اس کے مقابلہ میں احتساب کا مطلب ہے اللہ کی رضا کو سامنے رکھ کر کوئی کام کرنا۔

قساوت اور احتساب کا یہ فرق تمام معاملات میں ہے۔ کوئی بھی دینی عمل اللہ کے یہاں اسی وقت مقبول ہوتا ہے جب کہ وہ حساسیت کی سطح پر انجام دیا گیا ہو، بے حسی کی سطح پر کیا ہوا عمل ایک قسم کا مشینی عمل ہے اور مشینی عمل اللہ تعالیٰ کے یہاں مطلوب نہیں۔

کتنا فرق

سترھویں صدی میں جب کہ مغربی قومیں ایشیا اور افریقہ میں داخل ہوئیں، ان سے پہلے ان کے سیاح کثرت سے اِن ملکوں میں آئے۔ انھوں نے یہاں کی مقامی زبانیں سیکھیں، لوگوں سے میل جول پیدا کیا۔ لمبی لمبی مدت تک یہاں رہے۔ اس کے بعد انھوں نے یہاں کے حالات کے بارے میں تفصیل سے کتابیں لکھیں اور اپنی حکومتوں اور اپنی قوموں کو یہاں کے حالات سے باخبر کیا۔

انھیں میں سے ایک فرانسیسی سیاح ڈاکٹر برنیر (Bernier) ہے۔ وہ ایک باقاعدہ تعلیم یافتہ طبیب تھا۔ اس کے طب نے اس کو موقع دیا کہ وہ جہاں جائے وہاں زیادہ سے زیادہ لوگوں کے درمیان گھل مل کر رہ سکے۔ وہ اپنے اس فن کی وجہ سے اعلیٰ شخصیتوں تک رسائی کے قابل ہوگیا۔ برنیر ۱۶۲۰ء میں پیدا ہوا۔ ۱۶۴۷ میں اس نے جرمنی، پولینڈ، سوئٹزرلینڈ اور اٹلی کی سیاحت کی اور ان ملکوں کی سماجی اور سیاسی زندگی کو قریب سے دیکھا۔ ۱۶۵۴ میں برنیر ایشیا کے لئے روانہ ہوا۔ چند سال تک شام، مصر، فلسطین وغیرہ میں گھوما اور ۱۶۵۸ میں ہندستان میں سورت کی بندرگاہ پر اترا۔ یہ شاہ جہاں کا آخری زمانہ تھا اور اس کے بیٹوں میں اقتدار کی جنگ جاری تھی۔

برنیر ہندستان میں چودہ سال تک رہا۔ یہاں وہ سورت سے لے کر کشمیر تک بے شمار بستیوں میں گیا اور ہندستانی زندگی کے ہر شعبہ کے بارے میں تفصیلی معلومات حاصل کیں۔ وہ لکھتا ہے کہ میں نے پلوٹارک کے اس قول پر عمل کیا ہے کہ جزئی اور معمولی باتوں کو بھی ضرور جاننا چاہئے۔ کسی قوم کے متعلق رائے قائم کرنے کے لئے وہ بڑی بڑی باتوں سے زیادہ کارآمد ہیں۔ ہندستان سے واپس ہوکر برنیر جب فرانس پہنچا تو اس نے فرانس کے بادشاہ لوئی چہاردہم (Louis XIV) کے سامنے اپنا سفرنامہ ان الفاظ کے ساتھ پیش کیا: دریائے سین سے نکل کر دجلہ، فرات، سندھ یا گنگا جہاں بھی میں پہنچا، فرانس اور اس کے شہنشاہ کے بارے میں لوگوں کی بہت اونچی رائے پائی۔

ہندستان کے شہروں کا گہرا جائزہ لینے کے بعد برنیر نے لکھا: یہاں کے شہر اور قصبے خواہ اس وقت بظاہر خستہ حال اور ویران نہ ہوں مگر ایسا شہر کوئی نہیں جس میں جلد تباہ اور خراب ہوجانے کی علامتیں نہ پائی جاتی ہوں (۲۲۷) ہندستان کی اس وقت کی فوجوں کے بارے میں اس نے لکھا: جب میں ان بے ترتیب فوجوں کو دیکھتا تھا کہ حیوانوں کے گلوں کی مانند چلتی ہیں تو ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ ہمارے صرف ۲۵ ہزار تجربہ کار سپاہی پرنس کونڈی یا مارشل تورین کی قیادت میں ہندستان کی فوج پر، خواہ وہ کتنی ہی زیادہ کیوں

نہ ہو، غالب آسکتے ہیں (۵۵) برنیر نے اپنے تقریباً ۵۰۰ صفحات کے سفرنامہ میں لکھا کہ ہندستان میں تخت نشینی کے لئے جنگ ہونا لازمی ہے۔ کیونکہ جانشینی کے واضح اصول نہ ہونے کی وجہ سے کسی شہزادہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا کہ یا تو خود تخت حاصل کرے یا اپنے بھائیوں کے ہاتھوں قتل ہونے کے لئے تیار ہو جائے۔ اس نے لکھا کہ شاہی امرار کا اعزاز موروثی نہ ہونے کی وجہ سے یہاں ایک مستقل طبقہ امرار وجود میں نہیں آپاتا۔ جب تک ایسا نہ ہوگا سیاسی نظام کا استحکام ممکن نہیں ہے۔ وغیرہ

مغربی ملکوں کے سیاح جس زمانہ میں اپنی قوموں اور بادشاہوں کو اس قسم کی معلومات دے رہے تھے ٹھیک اسی زمانہ میں ہمارے یہاں کیا حال تھا۔ عین اس زمانہ میں لال قلعہ کے حکمراں کو اس کے قصیدہ خواں شاہ جہاں کا خطاب دے رہے تھے اور اس کے ذہن پر یہ تصور بیٹھا رہے تھے کہ جو ہندستان کا بادشاہ ہے وہی سارے عالم کا بادشاہ ہے۔ اورنگ زیب کے استاد ملا محمد صالح اپنے شاگرد شہزادہ کو یہ بتا رہے تھے کہ یورپ بس ایک چھوٹے سے جزیرے کے برابر ہے، فرانس اور اندلس کے بادشاہ ایسے ہی ہیں جیسے ہندستان کے چھوٹے چھوٹے راجہ۔ وہ اورنگ زیب کو ایسے فلسفہ اور منطق کا ماہر بنا رہے تھے جو جنگی مقابلوں، طرز حکمرانی اور قوموں کے ترقی و تنزل کو سمجھنے میں کام آنا تو درکنار اس قابل بھی نہ تھا کہ وہ آدمی کے اندر ایسا ذہن بنائے جو دلیل صحیح کے بغیر کسی چیز کو تسلیم نہ کرے اور اپنے اور غیر کے بارے میں حقیقی بنیادوں پر رائے قائم کر سکے۔ برنیر نے اپنے سفرنامہ میں تفصیل سے بتایا ہے کہ مغل شہزادوں کی تعلیم و تربیت کتنے غیر حقیقی انداز میں دی جاتی ہے (۱۵۶)

یہ تین سو سال پہلے کا واقعہ ہے۔ مگر حیرت انگیز بات ہے کہ آج بھی صورت حال ہمارے یہاں زیادہ مختلف نہیں۔ آج جب کہ دوسری قوموں کے رہنما اپنی قوموں کو حقیقت پسندی کا سبق دے رہے ہیں، مسلم قائدین ہر جگہ مسلمانوں کو جذبات کی شراب پلانے میں مشغول ہیں۔ کوئی پراسرار عملیات میں کامیابی کا راز بتا رہا ہے کوئی شاعری اور خطابت میں۔ کوئی جلسہ جلوس میں ترقی کا راستہ دکھا رہا ہے اور کوئی سیاسی اکھاڑ پچھاڑ میں۔ کوئی تجویزوں اور بیانات کے ذریعہ ملت کی تعمیر کا یقین دلا رہا ہے اور کوئی دوروں اور تقریروں کے ذریعہ ——— ہمارے یہاں "ملا محمد صالح" تو بے شمار ہیں۔ مگر "ڈاکٹر برنیر" کوئی ایک بھی نہیں۔ پوری ملت ایسے افراد سے خالی نظر آتی ہے جو آج کی دنیا کا گہرائی کے ساتھ جائزہ لیں اور خالص واقعاتی انداز میں وقت کے حقائق سے ملت کو باخبر کریں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ملا محمد صالح بننے کے لئے تو صرف ابن الوقتی کا سرمایہ کافی ہے، جب کہ ڈاکٹر برنیر بننے کے لئے پُر مشقت عمل درکار ہے، اور اپنے کو مشقت میں ڈالنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔

لشکر کا کام خط سے

یزید کے زمانہ میں عراق کا گورنر ابن زیاد تھا۔ وہ اسلامی تاریخ کا ایک بدنام شخص ہے۔ تاہم اس کے ایک واقعہ میں بڑی نصیحت ہے۔

اس کے زمانہ میں بعض سرحدی علاقوں میں بغاوت ہوگئی۔ اس کے درباریوں نے کہا کہ ہم کو فوراً لشکر بھیجنا چاہئے ورنہ باغی ہتھیار نہ رکھیں گے۔ ابن زیاد نے کہا کہ لشکر کی کوئی ضرورت نہیں۔ ہم ایک خط بھیجتے ہیں اور وہ خط ہی بغاوت کو فرو کرنے کے لئے کافی ہو جائے گا۔ اس موقع پر اس نے جو جملہ کہا تھا وہ عربی زبان میں اس مفہوم کے لئے ضرب المثل بن گیا ہے۔ اس نے کہا:

کتابٌ یَنُوْبُ عن کتائب ایک خط لشکر کا قائم مقام ہے

اس کے بعد ابن زیاد نے ایک دھمکی کا خط باغیوں کے نام روانہ کیا اور خط پاتے ہی انھوں نے گھبرا کر اپنی بغاوت ختم کر دی۔

ابو فراس حمدانی نے عباسی خلیفہ کی تعریف میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس میں وہ اسی قسم کی سیاست کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے:

اذا ما اَرسلَ الامراء جیشا الی الاعداء ارسلنا الکتابا

دوسرے امرار جہاں اپنے دشمن کے مقابلہ کے لئے لشکر بھیجتے ہیں وہاں ہم صرف خط بھیج دیتے ہیں

یہی گہری سیاست کا راز ہے۔ سیاست یہ نہیں ہے کہ جہاں کوئی حریف نظر آئے اس سے براہِ راست لڑائی چھیڑ دی جائے۔ یہ بیوقوفوں کی سیاست ہے جس کے نتیجہ میں خون خرابہ کے سوا اور کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ عقل مند آدمی کی سیاست ہمیشہ یہ ہوتی ہے کہ اپنے آپ کو اتنا طاقت ور اور مستحکم بنایا جائے کہ جب کسی کی طرف سے کوئی مسئلہ پیدا ہو تو اس کے نام ایک وارننگ لکھ کر بھیج دینا کافی ہو۔ لڑے بھڑے بغیر محض دھمکی سے معاملہ ختم ہو جائے۔

دشمن کے خلاف طاقت کا استعمال ہمیشہ اِس قیمت پر ہوتا ہے کہ دشمن کی طاقت کو اپنے خلاف استعمال کئے جانے کا خطرہ مول لیا جائے۔ دوطرفہ استعمال طاقت کے بعد فاتح کو بھی کھنڈر کے اوپر اپنا جشن فتح منانا پڑتا ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی لڑنے کے لئے مجبور کر دیا جاتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ سب سے بُری فتح وہ ہے جو لڑ کر حاصل ہو اور سب سے اچھی فتح وہ ہے جو لڑے بغیر آدمی کے حصہ میں آجائے۔

محفوظ سفر

جولائی ۱۹۶۹ میں امریکہ نے انسان بردار راکٹ چاند کی طرف بھیجا تھا۔ اس راکٹ کی خبروں میں بتایا گیا تھا کہ جب اس کی پہلی منزل کا انجن داغا گیا تو ایک بے حد ہولناک آواز پیدا ہوئی۔ یہ آواز اتنی تیز تھی کہ اس نے ایک سو میل کے رقبہ کو ہلا دیا۔ مگر جو خلا باز اس راکٹ میں سفر کر رہے تھے، ان کو صرف دس سکنڈ بعد یہ آواز سنائی دینا بند ہو گئی۔ وہ کان کے پردے پھاڑ دینے والی اس آواز سے محفوظ ہو کر اپنے سفر پر رواں ہو گئے۔

ایسا کیوں کر ہوا۔ اس کی وجہ انسان بردار راکٹ کی تیز رفتاری تھی۔ آواز معمولاً ہوا کے ذریعہ پھیلتی ہے، اس لئے اس کی رفتار سات سو میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب کہ راکٹ کی رفتار ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ سے بھی زیادہ تھی۔ رفتار کے اس فرق کی وجہ سے ایسا ہوا کہ صرف دس سکنڈ بعد راکٹ اس خوفناک آواز کی زد سے باہر جا چکا تھا۔ آواز سات سو میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چل رہی تھی اور راکٹ ۲۵ ہزار میل فی گھنٹہ کی رفتار سے بھاگ رہا تھا۔ اس فرق کا یہ نتیجہ ہوا کہ ابتدائی لمحات کے بعد راکٹ کے پھٹنے کی آواز خلا بازوں کے کنٹرول روم تک پہنچنا بند ہو گئی۔ خلا باز بھیانک آواز پیدا کرنے والی سواری میں سفر کر رہے تھے۔ مگر اس کے باوجود اس کی بھیانک آواز سے ان کے کان محفوظ تھے۔

اسی طرح ہر شخص اور ہر قوم کی زندگی میں یہ واقعہ پیش آتا ہے کہ ناخوش گوار حالات اس کا پیچھا کرتے ہیں۔ اب اگر وہ اپنی جدوجہد کی رفتار اتنی تیز کر لے کہ ناخوش گوار حالات کے مقابلہ میں اس کی رفتار بڑھ جائے تو وہ ان کی زد سے نکل جائے گا، وہ ان سے اسی طرح محفوظ ہو جائے گا جس طرح خلا باز اپنے راکٹ کے پھٹنے کی طوفانی آواز سے محفوظ ہو گئے۔

زندگی کا معاملہ بھی یہی ہے۔ ایک شخص یا قوم کے لئے ممکن ہے کہ یہاں بھی وہ ایسا سفر کر سکے جس میں وہ دوسروں کی زد سے محفوظ ہو۔ اگر دوسرے جلد بازی کی رفتار سے چل رہے ہوں اور آپ صبر کی رفتار سے چلنے لگیں۔ دوسرے منفی کارروائیوں کی بنیاد پر اٹھے ہوں اور آپ مثبت عمل کا طریقہ اختیار کریں۔ دوسرے مادی طاقت کے سہارے بڑھیں اور آپ اخلاقی طاقت کے زور پر کھڑے ہوں۔ دوسرے ظاہری انسان سے ٹکرا رہے ہوں اور آپ اندرونی انسان کو اپنا نشانہ بنائیں۔ تو یقینی ہے کہ آپ لوگوں کی زد سے اسی طرح باہر ہوں گے جس طرح راکٹ سوار اپنے راکٹ کی بھیانک آواز سے۔

سڑک بند ہے

سڑک کی مرمت ہو رہی ہو تو سڑک کے درمیان میں ایک بورڈ لگا دیا جاتا ہے جس پر لکھا ہوتا ہے "سڑک بند ہے"، مگر اس کا مطلب کبھی یہ نہیں ہوتا کہ سرے سے راستہ بند ہو گیا ہے اور اب آنے جانے والے اپنی گاڑی روک کر کھڑے ہو جائیں۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ "یہ سامنے کی سڑک بند ہے" ہر شخص کو اس قسم کے بورڈ کے معنی معلوم ہیں۔ چنانچہ سواریاں جب وہاں پہنچ کر بورڈ کو دیکھتی ہیں تو وہ ایک لمحہ کے لئے نہیں رکتیں۔ وہ دائیں بائیں گھوم کر اپنا راستہ نکال لیتی ہیں اور آگے جا کر دوبارہ سڑک پکڑ لیتی ہیں۔ اور اگر کسی وجہ سے دائیں بائیں راستہ نہ ہو تب بھی سواریوں کے لئے کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ اطراف کی سڑکوں سے اپنا سفر جاری رکھتی ہیں۔ کچھ دور آگے جا کر دوبارہ انھیں اصل سڑک مل جاتی ہے اور اس پر اپنا سفر جاری رکھتے ہوئے وہ منزل پر پہنچ جاتی ہیں۔ اس طرح کچھ منٹوں کی تاخیر تو ضرور ہو سکتی ہے۔ مگر ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کا سفر رک جائے یا وہ منزل پر پہنچنے میں ناکام رہیں۔

یہی صورت زندگی کے سفر کی بھی ہے۔ زندگی کی جد و جہد میں کبھی ایسا ہوتا ہے کہ آدمی محسوس کرتا ہے کہ اس کا راستہ بند ہے۔ مگر اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ سامنے کا راستہ بند ہے نہ کہ ہر طرف کا راستہ بند۔ جب بھی ایک راستہ بند ہو تو دوسرے بہت سے راستے کھلے ہوئے ہوں گے۔ عقل مند شخص وہ ہے جو اپنے سامنے "سڑک بند ہے" کا بورڈ دیکھ کر رک نہ جائے بلکہ دوسرے راستے تلاش کر کے اپنا سفر جاری رکھے۔

ایک میدان میں مواقع نہ ہوں تو دوسرے میدان میں اپنے لئے مواقع کار تلاش کر لیجئے۔ حریف سے براہ راست مقابلہ ممکن نہ ہو تو بالواسطہ مقابلہ کا طریقہ اختیار کیجئے۔ آگے کی صف میں آپ کو جگہ نہ مل رہی ہو تو پیچھے کی صف میں اپنے لئے جگہ حاصل کر لیجئے۔ ٹکراؤ کے ذریعہ مسئلہ حل ہوتا نظر نہ آتا ہو تو مصالحت کے ذریعہ مسئلہ کے حل کی صورت نکال لیجئے۔ دوسروں کا ساتھ حاصل نہ ہو رہا ہو تو تنہا اپنے کام کا آغاز کر دیجئے۔ چھت کی تعمیر کا سامان نہ ہو تو بنیاد کی تعمیر میں اپنے کو لگا دیجئے۔ بندوں سے ملتا ہوا نظر نہ آتا ہو تو خدا سے پانے کی کوشش کیجئے ـــــ ہر بند سڑک کے پاس ایک کھلی سڑک بھی ہوتی ہے۔ مگر اس کو وہی لوگ پاتے ہیں جو آنکھ والے ہوں۔

اخلاق کی طاقت

خوش اخلاقی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس سے آپ کا کوئی تعلق ہو یا جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہو اس کے ساتھ خوش اخلاقی برتنا۔ دوسرے یہ کہ خوش اخلاقی کو اپنی عام عادت بنالینا اور ہر ایک سے اچھے اخلاق کے ساتھ پیش آنا، خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ خوش اخلاقی کی پہلی قسم سے بھی آدمی کو کچھ نہ کچھ فائدہ ملتا ہے۔ مگر خوش اخلاقی کی دوسری قسم کے فائدے اتنے زیادہ ہیں کہ ان کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔

مسٹر اجوانی ۱۹۶۵ میں کلکتہ کی ایک بڑی دواساز فرم میں سیلز مین مقرر ہوئے۔ ان سے پہلے جو شخص ان کی جگہ پر کام کر رہا تھا اس کو ۱۲ سو روپے تنخواہ اور آمد و رفت کے لئے ریلوے کا کرایہ ملتا تھا۔ اجوانی نے کہا کہ میں تین ہزار روپے مہینہ لوں گا اور ہوائی جہاز سے سفر کروں گا۔ کارخانہ کے ڈائرکٹر نے کہا کہ یہ تو بہت زیادہ ہے۔ انھوں نے کہا: میں کام بھی بہت زیادہ دوں گا۔ آپ ایک بار تجربہ کر کے دیکھئے۔ بالآخر ان کا تقرر ہوگیا اور گجرات کا علاقہ ان کے سپرد ہوا۔

اس زمانہ میں گجرات میں ایک لیڈی ڈاکٹر تھی جس کی پریکٹس بہت کامیاب تھی اور اس کے یہاں دواؤں کی کھپت بہت زیادہ تھی۔ مگر وہ کسی مرد ایجنٹ سے نہیں ملتی تھی۔ ایک دواساز ادارہ کا ایجنٹ ایک بار اس کے یہاں آیا۔ باتوں کے دوران اس نے بتایا کہ میں پامسٹری جانتا ہوں اور ہاتھ بھی دیکھتا ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ اس کے سامنے کر دیا۔ ایجنٹ نے دیکھ کر کہا کہ آپ کے ہاتھ کی ریکھائیں بہت اچھی ہیں۔ یہ کہتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔ اس واقعہ کے بعد لیڈی ڈاکٹر کو مرد ایجنٹوں سے نفرت ہوگئی اور اس نے اپنے دواخانہ میں مرد ایجنٹوں کا داخلہ بالکل بند کر دیا۔

مسٹر اجوانی اپنے تجارتی سفر پر مذکورہ شہر کے لئے روانہ ہوئے تو کمپنی کے ڈائرکٹر سے لیڈی ڈاکٹر کا ذکر آیا۔ مسٹر اجوانی نے کہا کہ میں اس سے بھی آرڈر لوں گا۔ ڈائرکٹر نے اس کو ان کی سادگی پر محمول کیا۔ اس نے کہا کہ اس سے آرڈر لینا بالکل ناممکن ہے۔ لیڈی ڈاکٹر اس بارے میں اتنا زیادہ مشہور ہو چکی تھی کہ لوگوں نے اس کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا تھا۔

مسٹر اجوانی اپنے سفر پر روانہ ہو گئے۔ ہوائی جہاز میں ان کی سیٹ سے ملی ہوئی سیٹ پر ایک بوڑھی خاتون تھیں۔ راستہ میں ایسا ہوا کہ بوڑھی خاتون کو کھانسی اٹھی اور کف آنے لگا۔ بوڑھی خاتون پریشان ہوئیں۔ مسٹر اجوانی کو اپنی عام اخلاقی عادت کے مطابق اس خاتون سے ہمدردی پیدا ہوئی اور انھوں نے فوراً اپنا رومال اس

کے منھ کے سامنے کر دیا۔ اس کا کف اپنے رومال پر لے لیا اور پھر غسل خانہ میں جا کر اسے دھو لیا۔ خاتون اس واقعہ سے بہت متاثر ہوئی۔ اس خاتون کو بھی وہیں جانا تھا جہاں مسٹر اجوانی جا رہے تھے۔ ہوائی جہاز جب وہاں پہنچا اور بوڑھی خاتون باہر آئی تو وہ یہ دیکھ کر پریشان ہوئی کہ اس کو لینے کے لئے کوئی ہوائی اڈہ پر نہیں آیا ہے۔ یہ خاتون کسی بڑے گھر سے تعلق رکھتی تھی اور اس کو لینے کے لئے کار آنا چاہئے تھی۔ مگر اس کی آمد کی صحیح اطلاع نہ ہونے کی وجہ سے اس کے گھر سے کار نہ آسکی۔ مسٹر اجوانی نے یہاں دوبارہ اس کی مدد کی۔ انھوں نے کہا کہ میں ہوٹل جانے کے لئے ٹیکسی کر رہا ہوں۔ آپ اس پر بیٹھ جائیں۔ میں پہلے آپ کو آپ کے گھر اتار دوں گا۔ اس کے بعد اپنے ہوٹل پر جاؤں گا۔ چنانچہ انھوں نے بوڑھی خاتون کو اپنی ٹیکسی پر بٹھایا اور اس کو لے کر اس کے گھر پہنچے۔ خاتون نے اپنے گھر پہنچ کر ان کا نام اور پتہ پوچھا۔ انھوں نے اپنا نام اور ہوٹل کا پتہ لکھ کر دے دیا اور پھر اپنے ہوٹل آ گئے۔

کچھ دیر کے بعد بوڑھی خاتون کی لڑکی اپنے کام سے فارغ ہو کر گھر پہنچی تو دیکھا کہ اس کی ماں آئی ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ ہم کو آپ کی آمد کی خبر نہ تھی اس لئے گاڑی ہوائی اڈہ پر نہ جا سکی۔ آپ کو تو بہت تکلیف ہوئی ہوگی۔ ماں نے کہا کہ نہیں مجھ کو کوئی تکلیف نہیں ہوئی اور اس کے بعد اس نے مسٹر اجوانی کی پوری کہانی سنائی۔ یہ سن کر لڑکی بہت متاثر ہوئی۔ اس نے فوراً مذکورہ ہوٹل کو ٹیلی فون کر کے مسٹر اجوانی سے رابطہ قائم کیا اور کہا کہ ہم آپ کے بہت مشکور ہیں اور رات کا کھانا آپ ہمارے یہاں کھائیں۔ مسٹر اجوانی مقررہ پروگرام کے مطابق خاتون کے مکان پر پہنچ گئے۔ جب لوگ کھانے کی میز پر بیٹھے اور تعارف ہوا تو معلوم ہوا کہ بوڑھی خاتون کی لڑکی وہی لیڈی ڈاکٹر ہے جس کو مرد ایجنٹوں سے نفرت تھی اور وہ مرد ایجنٹوں سے ملاقات تک کی روادار نہ تھی۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ مسٹر اجوانی دواساز کمپنی کے سیلز مین ہیں تو اسی وقت اس نے خود اپنی طرف سے دواؤں کا ایک بڑا آرڈر لکھوا دیا۔ اور کہا کہ ہمارے یہاں دواؤں کی بہت کھپت ہے۔ آپ تو ہم کو مستقل گاہک سمجھ لیجئے اور ہر مہینہ دوائیں بھیجتے رہئے۔

مسٹر اجوانی کھانے اور ملاقات سے فارغ ہو کر ہوٹل واپس آئے اور اسی وقت کلکتہ میں اپنے ڈائرکٹر کو ٹرنک کال کیا۔ انھوں نے اپنے ڈائرکٹر کو ٹیلی فون پر بتایا کہ مذکورہ لیڈی ڈاکٹر سے میں نے اتنے ہزار کا آرڈر حاصل کر لیا ہے۔ ڈائرکٹر نے فوراً کہا تم غلط کہہ رہے ہو۔ ایسا تو کبھی ہو نہیں سکتا۔ تاہم اگلی ڈاک سے جب ڈائرکٹر کے پاس مذکورہ لیڈی ڈاکٹر کا چک اور اس کا دستخط شدہ آرڈر پہنچا تو اس کو معلوم ہوا کہ وہ واقعہ بالفعل پیش آچکا ہے جس کو وہ اب تک ناممکن سمجھے ہوئے تھا۔

۲۱ نومبر ۱۹۸۰ کی ملاقات میں میں نے مسٹر اجوانی سے پوچھا کہ آپ کو تجارت کا بہت تجربہ ہے۔ یہ بتائیے کہ تجارت میں کامیابی کا راز کیا ہے۔ انھوں نے جواب دیا: میٹھی زبان، اچھا سلوک۔ میں نے کہا ہاں، اور اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کا کوئی فائدہ نظر نہ آتا ہو۔ میٹھی زبان اور اچھا سلوک ہر حال میں مفید ہے، لیکن اگر وہ آدمی کا عام اخلاق بن جائے تو اس کے فائدوں کا کوئی ٹھکانا نہیں۔

مزاج کی اہمیت

ٹوائیٹا موٹر کمپنی جاپان کی ایک کار بنانے والی کمپنی ہے۔ پچھلے تقریباً ۳۰ سال میں کام کا ایک دن ضائع کئے بغیر اس نے اپنا پیداواری عمل جاری رکھا ہے۔ یہ صرف ایک مثال ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جاپان میں صنعتی ترقی کی اتنی تیز رفتاری کی وجہ کیا ہے۔ امریکہ کی جنرل موٹرس کارپوریشن اور فورڈ موٹر کمپنی دنیا کی سب سے بڑی موٹر ساز کمپنیاں سمجھی جاتی ہیں۔ مگر امریکہ کی ان کمپنیوں میں سالانہ پیداوار کا اوسطی مزدور گیارہ کاریں ہیں۔ جب کہ جاپان کی مذکورہ موٹر کمپنی میں سالانہ پیداوار کا اوسطی مزدور ۳۳ کاریں ہیں۔

جاپان کی اس غیر معمولی صنعتی ترقی کا راز اس کے مزدور ہیں۔ جاپانی مزدور کا تعمیری مزاج جاپان کی سب سے بڑی دولت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جاپان میں اگرچہ کوئلہ، لوہا، پٹرول اور دوسری دھاتیں یا تو بالکل پیدا نہیں ہوتیں یا بہت کم پیدا ہوتی ہیں اس کے باوجود جاپان کی صنعتی ترقی کی رفتار دنیا میں سب سے زیادہ ہے۔ جاپانی مزدور کے مزاج میں وہ کون سی بات ہے جو جاپان کے لئے سب سے بڑی دولت بن گئی ہے۔ ایک مبصر کے الفاظ میں وہ حسب ذیل ہے:

> A national spirit of compromise and co-operation and a willingness to endure short-term setbacks for the long-term good of the nation, company or a family.

جاپانیوں کی یہ قومی سیرت کہ وہ ہمیشہ مصالحت اور تعاون کے لئے تیار رہتے ہیں۔ قوم یا کمپنی یا خاندان کے وسیع تر مفاد کی خاطر وہ وقتی نقصان کو سہنے کے لئے راضی ہو جاتے ہیں۔ (ہندستان ٹائمس ۲۵ اگست ۱۹۸۱)

کسی قوم کی تعمیر میں سب سے اہم چیز اس کے افراد کا مزاج ہے۔ افراد کا مزاج اگر بگڑا ہوا ہے تو قوم کو تباہ ہونے سے کوئی چیز نہیں بچا سکتی اور اگر افراد کا مزاج درست ہے تو ایسی قوم ضرور کامیاب ہو کر رہتی ہے خواہ اس کے دشمنوں کی تعداد کتنی ہی زیادہ کیوں نہ ہو۔

قوم کی تعمیر میں افراد کا درجہ وہی ہے جو کسی عمارت میں اینٹوں کا ہے۔ کچی اینٹوں سے بنی ہوئی عمارت ایک بے اعتبار عمارت ہوتی ہے۔ کوئی بھی حادثہ اسے گرا سکتا ہے۔ اس کے برعکس جو عمارت پختہ اینٹوں سے بنی ہوئی ہو اس پر پورا بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ سیلاب اور طوفان کے علی الرغم زمین پر کھڑی رہتی ہے۔ ہر آندھی جو آتی ہے وہ اس سے ٹکرا کر واپس چلی جاتی ہے، وہ اس کا کچھ بگاڑنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔

تھوڑا وقت زیادہ کام

سرسید احمد خاں (۱۸۹۸ — ۱۸۱۷) نے ایک بار اپنی تقریر میں کہا: وقت کم ہے اور کام بہت۔ نہ مجھ میں یہ قوت ہے کہ سورج کو ٹھہرا کر دن کو بڑھا دوں، نہ یہ طاقت کہ سورج کو نکلنے سے باز رکھ کر رات کو وسعت دے دوں۔ اگر ایک طرف ایک کام پر متوجہ ہو جاتا ہوں تو اور بہت سے ضروری کام رہ جاتے ہیں (لکچروں کا مجموعہ مرتبہ منشی سراج الدین، ۱۸۹۰، صفحہ ۲۴۲)

سرسید نے جو بات اپنے لئے کہی وہی بات ہر ایک کے لئے صحیح ہے۔ ہر انسان اس مسئلہ سے دوچار ہے کہ اس کی زندگی بہت مختصر ہے۔ مگر اس کی ذمہ داریاں اتنی زیادہ ہیں کہ ان کی کوئی حد نہیں۔ آدمی کو تھوڑے سے وقت میں بہت زیادہ کام کرنا ہے۔ آدمی اگر اس حقیقت کو جان لے تو وہ اپنے اوقات کے معاملہ میں بے حد سنجیدہ ہو جائے، نہ صرف غیر ضروری بلکہ کم ضروری کاموں سے بھی دور رہ کر وہ صرف انتہائی ضروری کاموں میں مشغول رہے۔

پھر اگر اس معاملہ کو آخرت تک لے جایئے تو معاملہ اور زیادہ نازک ہو جاتا ہے۔ آخرت ایک ابدی جگہ ہے وہاں آدمی کو ہمیشہ ہمیش تک رہنا ہے۔ مگر آخرت کے لئے کام کرنے کا موقع آدمی کو صرف اس محدود مدت تک ملتا ہے جب کہ وہ موجودہ دنیا میں رہ رہا ہے۔ اس دنیا سے اٹھتے ہی آخرت کے لئے عمل کرنے کا موقع ختم ہو جائے گا۔ موجودہ دنیا میں آدمی کی عمر کتنی کم ہوتی ہے اور اس کا انجام اس کو کتنی زیادہ لمبی مدت تک بھگتنا ہے، آدمی کو اگر واقعی معنوں میں اس کا احساس ہو جائے تو وہ اتنا زیادہ محتاط اور سنجیدہ ہو جائے کہ اپنے اوقات کا ایک لمحہ ضائع کرنا بھی اس کو ایسا معلوم ہو کہ جیسے اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔

ایک مزدور کے پاس صرف اتنا پیسہ ہو جس سے وہ اپنی دو وقت کی روٹی کا انتظام کر سکے تو وہ اس پیسہ کو محفل رقص کا ٹکٹ خریدنے میں ضائع نہیں کرے گا۔ کسی پیدل مسافر کے پاس اگر اتنا ہی وقت ہو کہ وہ رات کے اندھیرے سے پہلے اپنے گھر پہنچ جائے تو وہ راستہ کی تفریح میں مشغول ہو کر یہ خطرہ مول نہیں لے گا کہ رات کا اندھیرا چھا جائے اور وہ اپنے گھر نہ پہنچ سکے۔

مگر آدمی جس بات کو اپنی دنیا کے معاملہ میں بخوبی جانتا ہے اسی کو وہ آخرت کے معاملہ میں بالکل بھول جاتا ہے۔ آدمی کے پاس آخرت کے عمل کے لئے تھوڑا وقت اور بہت معمولی اثاثہ ہے۔ مگر ہر ایک اس کو وقتی تماشوں میں اس طرح ضائع کر رہا ہے جیسے کہ اسے آخرت کی کوئی خبر ہی نہیں۔

جب یہ نوبت آجائے

انگلستان کا بادشاہ رچرڈ اول (۱۱۹۹ـ ۱۱۵۷) جس نے تیسری صلیبی جنگ لڑی، وہ ایک بڑی فوج لے کر شاہ مصر صلاح الدین ایوبی (۱۱۹۳ـ۱۱۳۷) کے مقابلہ کے لئے نکلا۔ رچرڈ کی فوج کے افسانے اس طرح مشہور ہو رہے تھے کہ مسلمانوں کی فوج میں پست ہمتی کے آثار پیدا ہو گئے۔ صلاح الدین ایوبی نے اپنے دو خاص جاسوسوں کو طلب کیا اور ان کو حکم دیا کہ وہ جائیں اور رچرڈ کی فوج کے حالات معلوم کریں۔ جاسوس بھیس بدل کر روانہ ہوئے اور عیسائی فوج میں داخل ہو گئے۔ ایک رات اور ایک دن انھوں نے اِدھر اُدھر پھر کر عیسائی فوج کا جائزہ لیا۔ واپس آکر انھوں نے صلاح الدین ایوبی کو خبر دی کہ ہم نے عیسائی لشکر کے خیموں میں دو باتیں خاص طور پر دیکھیں۔ ایک یہ کہ ان کے فوجی شراب و کباب میں مست ہیں اور رنگ رلیاں منا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ فوج کے ساتھ جو پادری آئے ہیں وہ مذہبی بحثوں میں مشغول ہیں۔ ہم نے ان کو اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے پایا کہ حضرت عیسیٰ کا پیشاب پاخانہ پاک تھا یا ناپاک۔

صلاح الدین ایوبی نے یہ روداد سننے کے بعد اپنے فوجی افسروں کو بلایا اور ان کے سامنے تقریر کرتے ہوئے کہا: خدا کی قسم عیسائی فوج رسوا ہو کر رہے گی۔ جس قوم کا یہ حال ہو کہ اس کے خواص عیش و عشرت میں غرق ہوں اور اس کا مذہبی طبقہ اپنے پیشواؤں کی فضیلت پر بحث مباحثہ میں مشغول ہو، خدا کے یہاں اس کا یہی انجام مقدر ہے۔ تم خدا کے بھروسہ پر آگے بڑھو۔ یقیناً تم ہی کامیاب ہو گے۔ اس کے بعد صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں اس کی فوج آگے بڑھی اور عیسائی فوج کو ایسی سخت شکست دی کہ وہ میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

کسی قوم کے کمزور اور زوال یافتہ ہونے کی یہ خاص پہچان ہے کہ اس کے مذہبی رہنما فضول قسم کی مذہبی بحثوں میں مشغول ہوں اور اس کے دنیوی رہنما فضول قسم کی عیاشیوں میں۔ فضول قسم کی مذہبی بحثیں اس بات کی علامت ہیں کہ آدمی کا رشتہ معنوی حقیقتوں سے ٹوٹ چکا ہے۔ اس کے پاس مذہب کا خول باقی رہ گیا ہے نہ کہ اس کی حقیقت۔ پھر جو لوگ الفاظ کی دنیا میں جی رہے ہوں وہ حقیقت کی دنیا میں کوئی کارنامہ کس طرح دکھا سکتے ہیں۔ اسی طرح قوم کے بڑوں کا فضول عیاشیوں میں مشغول ہونا اس بات کی علامت ہے کہ زندگی ان کے نزدیک خوش باشی کا نام ہے نہ کہ جد و جہد کا۔ وہ ذاتی خواہش میں جی رہے ہیں نہ کہ زندگی کے وسیع تر تقاضوں میں۔

طلسماتی مذہب ذہنی پستی پیدا کرتا ہے اور طلسماتی عیاشیاں عملی کمزوری۔ اور جن لوگوں میں یہ دونوں چیزیں جمع ہو جائیں ان کو کوئی چیز تباہی سے بچا نہیں سکتی۔

معلومات نہیں، ذہنی رجحان

نوبل انعام کا حصول، سائنس کی دنیا میں، اعلیٰ ترین کارکردگی کا ایک مسلمہ معیار سمجھا جاتا ہے۔ یہ انعام کسی کو کیسے حاصل ہوتا ہے۔ کیمسٹری کے نوبل انعام یافتہ ایچ۔ اے۔ کریبز (H. A. Krebs) نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اعلیٰ سائنس داں بننے کے لئے اعلیٰ ساز وسامان والی لیبارٹریوں اور جدید ترین لٹریچر پر مشتمل لائبریریوں سے بھی کہیں زیادہ ضروری بات یہ ہے کہ کچھ مدت کے لئے کسی بڑی سائنسی شخصیت کی صحبت و رفاقت میسر آجائے۔ "اگر مجھے اپنی جوانی کے ابتدائی چار سال" وہ لکھتا ہے "آٹو وار برگ (Otto Warburg) جیسے سائنس داں کی رفاقت میسر نہ آتی تو میرے اندر سائنس کا صحیح ذوق پیدا ہونا محال تھا۔"

کریبز مختلف بڑے سائنس دانوں کے اقوال پیش کرتے ہوئے بتاتا ہے کہ اعلیٰ سائنس دانوں کی صحبت جو سب سے بڑی چیز کسی کو دیتی ہے وہ سائنسی حقائق اور سائنسی طریقوں کے بارے میں معلومات کا انبار نہیں ہے۔ یہ دونوں چیزیں تو ہر جگہ سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔ جو بات حقیقی فرق پیدا کرتی ہے، وہ دراصل فیضانِ نظر ہے جسے استاد اپنے شاگرد میں منتقل کرتا ہے۔ یہی فیضانِ نظر، جس کو وہ عمومی سائنسی روح (GReneral Scientific Spirit) کا نام دیتا ہے، کسی شخص کو سچا سکالر بناتا ہے۔ وہ لکھتا ہے:

> "سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ایک عظیم استاد یا سائنس داں اپنے شاگرد کے ذہن میں حقائق کے بارے میں معلومات سے کہیں زیادہ ایک ذہنی رویہ (Attitude) منتقل کرتا ہے۔۔۔ اس ذہنی رویہ میں دو باتیں بالخصوص بہت اہم ہیں۔ ایک عجز (Humility) دوسرا شوق (Enthusiasm)

عجز اور شوق دو سب سے بڑے زینے ہیں جن سے گزر کر آدمی اونچی ترقی کی منزل تک پہنچتا ہے۔ شوق آدمی کو اکساتا ہے کہ وہ کہیں رکے بغیر اپنا سفر جاری رکھے۔ شوق آدمی کے اندر تجسس کا جذبہ ابھارتا ہے جس کی وجہ سے وہ چیزوں کی حقیقت جاننے کی کرید میں رہتا ہے۔ تاہم جستجو کا شوق ہی کافی نہیں۔ اسی کے ساتھ عجز بھی انتہائی طور پر ضروری ہے۔ عجز کا مطلب ہے اپنے آپ کو حقیقت اعلیٰ سے کم سمجھنا۔ ایسا آدمی غلطی معلوم ہوتے ہی فوراً اس کا اعتراف کرلیتا ہے۔ وہ کسی بات کو ماننے سے کبھی اس لئے نہیں رکتا کہ اس کی وجہ سے اس کا وقار کم ہو جائے گا۔ وہ حق کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے نہ کہ کسی اور چیز کو۔

انسان کی تلاش

انسان کے اندر ایک عجیب خصوصیت ہے جو کسی دوسری مخلوق میں نہیں۔ وہ ہے لامتناہی تلاش کا جذبہ۔ ہر آدمی اپنے پیدائشی جذبہ کے تحت ایک ایسی نامعلوم چیز کی تلاش میں رہتا ہے جس کو اس نے پایا نہیں۔ کوئی بھی کامیابی اس کو اس طلب کے بارے میں مطمئن نہیں کرتی، کوئی بھی ناکامی اس کے اندر سے اس جذبہ کو فنا نہیں کر پاتی۔ فلاسفہ اس کو آئیڈیل کی طلب کہتے ہیں۔

یہ آئیڈیل کی طلب ہی تمام انسانی سرگرمیوں کی حقیقی اور آخری قوت محرکہ ہے۔ اگر یہ طلب نہ ہو تو دنیا کی تمام سرگرمیاں اچانک ٹھپ ہو کر رہ جائیں۔ انسانی ذہن کی یہی وہ زبردست طلب ہے جس کو فرائڈ نے غلط طور پر جنسی خواہش سے تعبیر کیا۔ ایڈلر نے اس کو غلط طور پر حصول طاقت کی خواہش قرار دیا۔ میک ڈوگل نے غلط طور پر کہا کہ یہ انسان کی تمام حیوانی جبلتوں کے مخلوطہ کا ایک پُراسرار نتیجہ ہے۔ مارکس نے اس کو غلط طور پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ یہ انسانی زندگی کی معاشی خواہش ہے اور یہی اس کی تمام سرگرمیوں کو کنٹرول کرتی ہے۔ مگر ان توجیہات کو غلط قرار دینے کے لئے یہی واقعہ کافی ہے کہ یہ چیزیں جن لوگوں کو پوری طرح ملیں وہ بھی مطمئن نہ ہو سکے۔ ان کی اندرونی ہستی بھی اسی طرح بے چین رہی جس طرح ان چیزوں سے محروم رہنے والے بے چین نظر آتے ہیں۔

انسان ہزاروں برس سے اپنے اس آئیڈیل کو دنیا کی چیزوں میں تلاش کر رہا ہے، مگر کوئی بھی شخص اس اطمینان سے دوچار نہیں ہوا کہ اس نے اپنی تلاش کا مکمل جواب پالیا ہے۔ اس معاملہ میں بادشاہ یا امیر بھی اتنا ہی غیر مطمئن رہتا ہے جتنا کوئی بے زور اور مفلس آدمی۔ یہ لمبا تجربہ یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ "نظر آنے والی" دنیا میں آدمی کی تلاش کا جواب موجود نہیں۔ اس کا جواب اس "نظر نہ آنے والی" دنیا میں ہے جس کو آدمی محسوس تو کرتا ہے مگر دیکھ نہیں پاتا۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ طلب خدا کی طلب ہے۔ آدمی جس آئیڈیل کو پانے کے لئے بے قرار رہتا ہے وہ خود اس کا خالق ہے۔ ہر آدمی جس چیز کی تلاش میں ہے وہ دراصل وہ خدا ہے جو اس کی روح میں سمایا ہوا ہے۔ ہر آدمی اپنی فطرت کے تحت مسلسل خدا کی جستجو میں رہتا ہے وہ اپنے اس اندرونی جذبہ کے تحت دنیا کی مختلف چیزوں کی طرف دوڑتا ہے اور سمجھتا ہے کہ شاید یہ چیز اس کی تلاش کا جواب ہو۔ مگر جب وہ اس کو پالیتا ہے اور قریب سے اس کا تجزیہ کرتا ہے تو اس کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیز وہ نہیں جس کی تلاش میں وہ سرگرداں تھا۔

کیا تمہارا یہ گمان ہے کہ تم چھوڑ دئے جاؤ گے حالاں کہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو جانا ہی نہیں جنھوں نے جہاد کیا اور جنھوں نے اللہ اور رسول اور مومنین کے سوا کسی کو دوست نہیں بنایا اور اللہ جانتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو ۱۶

موجودہ دنیا میں آدمی جب کسی چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بناتا ہے تو اس کو حاصل کرنے میں طرح طرح کے مسائل اور تقاضے سامنے آتے ہیں۔ اگر آدمی کو اپنا مقصد عزیز ہے تو وہ ان مسائل کو عبور کرنے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے میں اپنی ساری قوت لگا دیتا ہے۔ اسی کا نام جہاد ہے۔ یہ جہاد اس دنیا میں ہر ایک کو پیش آتا ہے۔ ہر آدمی کو جہاد کی سطح پر اپنی طلب کا ثبوت دینا پڑتا ہے اس کے بعد ہی یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ اپنی طلب میں کامیاب ہو۔ فرق یہ ہے کہ غیر مومن دنیا کی راہ میں جہاد کرتا ہے اور مومن آخرت کی راہ میں۔

یہی جہاد یہ ثابت کرتا ہے کہ آدمی اپنے مقصد میں کتنا سنجیدہ ہے۔ ایک شخص جو ایمان کا مدعی ہو اس کے سامنے بار بار مختلف مواقع آتے ہیں جو اس کے دعوے کا امتحان ہوں۔ کبھی اس کا دل کسی کے خلاف بغض و حسد کے جذبات سے متاثر ہونے لگتا ہے اور اس کا ایمان اس سے کہتا ہے کہ اس قسم کے تمام جذبات کو اپنے اندر سے نکال دو۔ کبھی اس کی زبان پر ناپسندیدہ کلمات آتے ہیں اور ایمان کا تقاضہ یہ ہوتا ہے کہ اس وقت اپنی زبان کو پکڑ لیا جائے۔ کبھی معاملات کے دوران کسی کو ایسا حق دینا پڑتا ہے جو قلب کو بالکل ناگوار ہو مگر ایمان یہ کہہ رہا ہوتا ہے کہ حق دار کو انصاف کے مطابق اس کا پورا حق پہنچایا جائے۔ اسی طرح اسلام کی دعوت کبھی ایسے موڑ پر پہنچ جاتی ہے کہ ایمان یہ کہتا ہے کہ اس کو کامیاب بنانے کے لئے اپنی جان و مال قربان کر دو۔ ایسے تمام مواقع پر گریز یا فرار سے بچنا اور ہر قیمت پر ایمان و اسلام کے تقاضے پورے کرتے رہنا، اسی کا نام جہاد ہے۔

جب کوئی شخص اسلام کے لئے مجاہد بن جائے تو اس کا تمام تر نفسیاتی تعلق اللہ اور رسول اور اہل ایمان سے ہو جاتا ہے۔ وہ ان کے سوا کسی کو اپنا ولیجہ نہیں بناتا۔ وَلِیجَ کے معنی ہیں داخل ہونا۔ ولیجہ کسی وادی کے اس غار کو کہتے ہیں جہاں راستہ چلنے والے بارش وغیرہ سے پناہ لیں۔ اسی سے ولیجہ ہے، یعنی دلی دوست۔

موجودہ دنیا میں جب بھی آدمی کسی وسیع تر مقصد کو اپناتا ہے تو اس کو لازماً ایسا کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنے مقصد کی مرکزیت سے وابستہ ہو۔ وہ اپنے قائد کا مکمل وفادار بنے۔ وہ اس راہ کے ساتھیوں سے پوری طرح جڑ جائے۔ مقصدیت کے احساس کے ساتھ یہ چیزیں لازم ملزوم ہیں۔ ان کے بغیر با مقصد زندگی کا دعویٰ بالکل جھوٹا ہے۔ اسی طرح آدمی جب دین کو سنجیدگی کے ساتھ اپنی زندگی میں داخل کرے گا تو لازمی طور پر ایسا ہوگا کہ خدا اور رسول اور اہل ایمان اس کا "ولیجہ" بن جائیں گے۔ وہ ہر اعتبار سے ان کے ساتھ جڑ جائے گا۔ سنجیدگی کے ساتھ دین اختیار کرنے والے کے لئے اللہ اور رسول اور اہل ایمان، عملی طور پر، ایسی وحدت کے اجزاء ہیں جن کے درمیان تقسیم ممکن نہیں۔

اس معاملہ کی نزاکت بہت بڑھ جاتی ہے جب یہ سامنے رکھا جائے کہ اس کی جانچ کرنے والا وہ ہے جس کو کھلے اور چھپے کا علم ہے، وہ ہر آدمی سے اس کی حقیقت کے اعتبار سے معاملہ کرے گا نہ کہ اس کے ظاہری رویہ کے اعتبار سے۔

مشرکوں کا کام نہیں کہ وہ اللہ کی مسجدوں کو آباد کریں حالاں کہ وہ خود اپنے اوپر کفر کے گواہ ہیں۔ ان لوگوں کے اعمال اکارت گئے اور وہ ہمیشہ آگ میں رہنے والے ہیں۔ اللہ کی مسجدوں کو تو وہ آباد کرتا ہے جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لائے اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ ادا کرے اور اللہ کے سوا کسی سے نہ ڈرے۔ ایسے لوگ امید ہے کہ ہدایت پانے والوں میں سے بنیں۔ کیا تم نے حاجیوں کے پانی پلانے اور مسجد حرام کے بسانے کو برابر کر دیا اس شخص کے جو اللہ اور آخرت پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا، اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہو سکتے۔ اور اللہ ظالم لوگوں کو راہ نہیں دکھاتا۔ جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی اور اللہ کے راستہ میں اپنے جان و مال سے جہاد کیا، ان کا درجہ اللہ کے یہاں بڑا ہے اور یہی لوگ کامیاب ہیں۔ ان کا رب ان کو خوش خبری دیتا ہے اپنی رحمت اور خوشنودی کی اور ایسے باغوں کی جن میں ان کے لئے دائمی نعمت ہوگی، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ بے شک اللہ ہی کے پاس بڑا اجر ہے ۲۲ — ۱۷

نزول قرآن کے وقت عرب میں یہ صورت حال تھی کہ مسلمان رسول اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع تھے اور مشرکین بیت اللہ کے گرد۔ اس وقت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عظمتوں کی وہ تاریخ وابستہ نہیں ہوئی تھی جس کو آج ہم جانتے ہیں۔ لوگوں کو آپ عام انسانوں کی طرح ایک انسان دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف مسجد حرام ہزاروں برس کی تاریخ کے نتیجہ میں عظمت و تقدس کی علامت بنی ہوئی تھی۔ مشرکین کی نظر میں اپنی تصویر تو یہ تھی کہ وہ ایک مقدس ترین مرکز کے خادم اور آباد کار ہیں۔ دوسری طرف جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے تو اس وقت کے حالات میں ان کو ایسا معلوم ہوتا جیسے کچھ لوگ بس ایک دیوانہ کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔

مگر مشرکین کا یہ خیال سراسر باطل تھا۔ وہ ظواہر کا تقابل حقائق سے کرنے کی غلطی کر رہے تھے۔ مسجد حرام کے زائرین کو پانی پلانا، اس کے اندر روشنی اور صفائی کا انتظام۔ کعبہ پر غلاف چڑھا دینا۔ مسجد کے فرش اور دیوار کی مرمت، یہ سب ظاہری نمائش کی چیزیں ہیں۔ یہ بھلا ان اعمال کے برابر ہو سکتی ہیں جب کہ آدمی اللہ کو پا لیتا ہے اور آخرت کی فکر میں جینے لگتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور اپنے اثاثہ کو خدا کے حوالے کر دیتا ہے۔ وہ دوسری تمام بڑائیوں کا انکار کر کے ایک خدا کو اپنا بڑا بنا لیتا ہے۔ سچائی کو پانے والے دراصل وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس کو معانی کی سطح پر پایا ہو نہ کہ ظواہر کی سطح پر۔ جو قربانی کی حد تک سچائی سے تعلق رکھنے والے ہوں نہ کہ محض سطحی اور نمائشی کارروائیوں کی حد تک۔

اللہ سے تعلق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک تعلق وہ ہے جو رسمی عقیدہ کی حد تک ہوتا ہے، جس میں آدمی کچھ دکھاوے کے اعمال تو کرتا ہے مگر اپنے کو اور اپنے مال کو خدا کی راہ میں نہیں دیتا۔ دوسرا تعلق وہ ہے جب کہ آدمی اپنے ایمان میں اتنا سنجیدہ ہو کہ اس راہ میں اس کو جو کچھ چھوڑنا پڑے وہ اس کو چھوڑ دے اور جو چیز دینی پڑے اس کو دینے کے لئے تیار ہو جائے۔ یہی دوسری قسم کے بندے ہیں جو مرنے کے بعد خدا کے یہاں اعلیٰ ترین انعامات سے نوازے جائیں گے۔

اے ایمان والو اپنے باپوں اور اپنے بھائیوں کو دوست نہ بناؤ اگر وہ ایمان کے مقابلہ میں کفر کو عزیز رکھیں۔ اور تم میں سے جو ان کو اپنا دوست بنائیں گے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں۔ کہو کہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے لڑکے اور تمھارے بھائی اور تمھاری بیویاں اور تمھارا خاندان اور وہ جو تم نے کمائے ہیں اور وہ تجارت جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور وہ گھر جن کو تم پسند کرتے ہو، یہ سب تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیج دے اور اللہ نافرمان لوگوں کو راستہ نہیں دیتا۔ ۲۳ — ۲۴

لوگوں کے لئے اپنا خاندان، اپنی جائداد، اپنے معاشی مفادات سب سے قیمتی ہوتے ہیں۔ انھیں چیزوں کو وہ سب سے زیادہ اہم سمجھتے ہیں۔ ہر دوسری چیز کے مقابلہ میں وہ ان کو ترجیح دیتے ہیں اور اپنا سب کچھ ان کے اوپر نثار کر دیتے ہیں۔ اس قسم کی زندگی دنیا دارانہ زندگی ہے۔ ایسا آدمی جو کچھ پاتا ہے بس اسی دنیا میں پاتا ہے۔ موت کے بعد والی ابدی دنیا میں اس کے لئے کچھ نہیں۔ اس کے برعکس دوسری زندگی وہ ہے جب کہ آدمی اللہ اور رسول کو اور اللہ کی راہ میں جدوجہد کو سب سے زیادہ اہمیت دے اور اس کی خاطر دوسری ہر چیز چھوڑنے کے لئے تیار رہے۔ یہی دوسری زندگی خدا پرستانہ زندگی ہے اور ایسے ہی لوگوں کے لئے آخرت میں ابدی جنتوں کے دروازے کھولے جائیں گے۔

ایک زندگی وہ ہے جو دنیوی تعلقات اور دنیوی مفادات کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دوسری زندگی وہ ہے جو ایمان کی بنیاد پر قائم ہوتی ہے۔ دونوں میں سے جس چیز کو بھی آدمی اپنی زندگی کی بنیاد بنائے، وہ ہمیشہ اس قیمت پر ہوتا ہے کہ وہ اس کی خاطر دوسری چیزوں کو چھوڑ دے۔ وہ کچھ لوگوں سے تعلق قائم کرے اور کچھ دوسرے لوگوں سے بے تعلق ہو جائے۔ وہ کچھ چیزوں کی بقاء اور ترقی میں اپنی ساری توجہ لگا دے اور کچھ دوسری چیزوں کی بقاء اور ترقی کے معاملہ میں بے پروا بنا رہے۔ کچھ نقصانات اس کو کسی قیمت پر گوارا نہ ہوں، وہ جان پر کھیل کر اور اپنا بہترین سرمایہ خرچ کر کے ان کو بچانے کی کوشش کرے اور کچھ دوسرے نقصانات کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھے مگر ان کے بارے میں اس کے اندر کوئی تڑپ پیدا نہ ہو۔ دنیا ہمیشہ ان لوگوں کو ملتی ہے جو دنیا کی خاطر اپنا سب کچھ لگا دیں۔ اسی طرح آخرت صرف ان لوگوں کے حصہ میں آئے گی جو آخرت کی خاطر دوسری چیزوں کو قربان کر دیں۔

ترجیح (ایک کو چھوڑ کر دوسرے کو اختیار کرنے کا معاملہ) انتہائی سنگین ہے۔ حتیٰ کہ وہی آدمی کے کفر و ایمان کا فیصلہ کرتا ہے۔ خدا کی دنیا میں جس طرح کھلے کافروں کے لئے کامیابی مقدر نہیں ہے اسی طرح ان لوگوں کے لئے بھی یہاں کامیابی کا کوئی امکان نہیں جو ایمان کا دعویٰ کریں اور جب نازک موقع آئے تو وہ آخرت پسندانہ روش کے مقابلہ میں دنیا دارانہ روش کو ترجیح دیں۔ ایسے مدعیان ایمان اگر اپنے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا ہوں تو ان کو اس وقت معلوم ہو جائے گا جب اللہ اپنا فیصلہ ظاہر کر دے گا۔

بے شک اللہ نے بہت سے موقعوں پر تمھاری مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تمھاری کثرت نے تم کو ناز میں مبتلا کر دیا تھا۔ پھر وہ تمھارے کچھ کام نہ آئی۔ اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہوگئی، پھر تم پیٹھ پھیر کر بھاگے۔ اس کے بعد اللہ نے اپنے رسول اور مومنین پر اپنی سکینت اتاری اور ایسے لشکر اتارے جن کو تم نے نہیں دیکھا اور اللہ نے کافروں کو سزا دی اور یہی کافروں کا بدلہ ہے۔ پھر اس کے بعد اللہ جس کو چاہے توبہ نصیب کر دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اے ایمان والو، مشرکین بالکل ناپاک ہیں۔ پس وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ آئیں اور اگر تم کو مفلسی کا اندیشہ ہو تو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تم کو بے نیاز کر دے گا اللہ علیم وحکیم ہے ۲۸-۲۵

مسلمانوں کا غلبہ کافروں کو ان کے کفر کی سزا کا اگلا نتیجہ ہے۔ مگر کافروں کا کفر مسلمانوں کے اسلام کی نسبت سے متحقق ہوتا ہے۔ اگر مسلمان اپنی اسلامیت کھو دیں تو کافروں کا کفر کس چیز کے مقابلہ میں ثابت ہوگا اور کس بنیاد پر خدا وہ تفریقی معاملہ کرے گا جو ایک کے لئے انعام بنے اور دوسرے کے لئے سزا۔

رمضان ۸ھ میں مسلمانوں نے قریش کو کامیاب طور پر مغلوب کر کے مکہ کو فتح کیا۔ مگر اگلے ہی مہینہ شوال ۸ھ میں ان کو ہوازن وثقیف کے مشرک قبائل کے مقابلہ میں شکست ہوئی، جب کہ فتح مکہ کے وقت مسلمانوں کی تعداد دس ہزار تھی اور ہوازن وثقیف سے مقابلہ کے وقت بارہ ہزار۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قریش سے مقابلہ کے وقت مسلمان صرف اللہ کے بھروسے پر نکلے تھے۔ مگر ہوازن وثقیف کے مقابلہ پر نکلتے ہوئے انھیں یہ ناز ہوگیا کہ اب تو ہم فاتح مکہ ہیں۔ ہمارے ساتھ بارہ ہزار آدمیوں کا لشکر ہے، آج ہم کو کون شکست دے سکتا ہے۔ جب وہ خدا کے اعتماد پر تھے تو انھیں کامیابی ہوئی، جب ان کو اپنی ذات پر اعتماد ہوگیا تو انھیں شکست کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنی ذات پر بھروسہ آدمی کے اندر گھمنڈ کا جذبہ ابھارتا ہے جس کے نتیجہ میں خارجی حقیقتوں سے بے پروائی پیدا ہوتی ہے۔ وہ نظم کی پابندی میں کوتاہ ہو جاتا ہے۔ وہ بے جا خود اعتمادی کی وجہ سے غیر حقیقت پسندانہ اقدام کرنے لگتا ہے جس کا نتیجہ اس عالم اسباب میں لازمی شکست ہے۔ اس کے برعکس خدا پر بھروسہ سب سے بڑی طاقت پر بھروسہ ہے۔ اس سے آدمی کے اندر تواضع کا جذبہ ابھرتا ہے۔ وہ انتہائی حقیقت پسند بن جاتا ہے۔ اور حقیقت پسندی بلاشبہ تمام کامیابیوں کی جڑ ہے۔

ابتداً جب یہ حکم آیا کہ حرم میں مشرکوں کا داخلہ بند کر دو تو مسلمانوں کو تشویش ہوئی کیونکہ غیر زرعی ملک ہونے کی وجہ سے عرب کی اقتصادیات کا انحصار تجارت پر تھا اور تجارت کی بنیاد ہمیشہ مشترکہ تعلقات پر ہوتی ہے۔ مسلمانوں نے سوچا کہ جب حرم میں مشرکین کا آنا بند ہوگا تو ان کے ساتھ تجارتی رشتے بھی ٹوٹ جائیں گے۔ مگر ان کی نظر اس امکان پر نہیں گئی کہ آج کے مشرک کل کے مسلمان ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ عربوں کے عمومی طور پر اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے تجارتی سرگرمیاں دوبارہ نئی صورت سے بحال ہوگئیں۔ نیز اس ابتدائی قربانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ بالآخر اسلام ایک بین اقوامی دین بن گیا۔ جو معاشی دروازے مقامی سطح پر بند ہوتے نظر آتے تھے وہ عالمی سطح پر کھل گئے۔

ان اہل کتاب سے لڑو جو نہ اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ اللہ اور اس کے رسول کے حرام ٹھہرائے ہوئے کو حرام ٹھہراتے اور نہ دین حق کو اپنا دین بناتے یہاں تک کہ وہ اپنے ہاتھ سے جزیہ دیں اور چھوٹے بن کر رہیں۔ اور یہود نے کہا کہ عزیر اللہ کے بیٹے ہیں اور نصاریٰ نے کہا کہ مسیح اللہ کے بیٹے ہیں۔ یہ ان کے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ وہ ان لوگوں کی بات کی نقل کر رہے ہیں جنھوں نے ان سے پہلے کفر کیا۔ اللہ ان کو ہلاک کرے، وہ کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ انھوں نے اللہ کے سوا اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنا ڈالا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو صرف یہ حکم تھا کہ وہ ایک معبود کی عبادت کریں۔ وہ پاک ہے اس سے جو وہ شریک کرتے ہیں ۳۱ - ۲۹

ایمان زندہ ہو تو آدمی ہر واقعہ کو خدا کی طرف منسوب کرتا ہے۔ وہ کسی چیز کو صرف اس وقت سمجھ پاتا ہے جب کہ خدا کی نسبت سے اس کے بارے میں رائے قائم کرلے۔ وہ پھول کی خوشبو کو اس وقت سمجھتا ہے جب کہ اس میں اسے خدا کی مہک مل جائے۔ وہ سورج کو اس وقت دریافت کرتا ہے جب کہ وہ اس کے معطی کو معلوم کرلے۔ ہر بڑائی اس کو خدا کا عطیہ نظر آتی ہے۔ ہر خوبی اس کو خدا کا احسان یاد دلاتی ہے۔ اس کے برعکس اگر خدا سے آدمی کا تعلق گھٹ کر صرف موہوم عقیدہ کے درجہ پر آجائے تو خدا اس کے زندہ شعور کے لئے ایک لامعلوم چیز بن جائے گا۔ وہ دنیا کی نظر آنے والی چیزوں پر خدا کو قیاس کرنے لگے گا۔

دوسری قسم کے لوگ طبعی طور پر خالق کو ان دنیوی چیزوں کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں جن کو وہ جانتے ہیں۔ وہ خالق کو مخلوق کی سطح پر اتار لاتے ہیں۔ یہی حال یہود و نصاریٰ کا اپنے بگاڑ کے زمانہ میں ہوا۔ اب خدا ان کے یہاں موہوم معتقدات کے خانہ میں چلا گیا۔ چنانچہ وہ اپنے نظر آنے والے اکابر اور بزرگوں کو وہ درجہ دینے لگے جو درجہ خدائے عالم الغیب کو دینا چاہئے۔ انھوں نے دیکھا کہ یونانی اور رومی قومیں سورج کو خدا بنا کر اس کے لئے بیٹا فرض کئے ہوئے ہیں تو ان کو بھی اپنے بزرگوں کے لئے یہی سب سے اونچا لفظ نظر آیا۔ انھوں نے اپنی آسمانی کتابوں میں اب اور ابن کے الفاظ کی خود ساختہ تشریح کرکے خدا کو باپ اور اپنے پیغمبر کو اس کا بیٹا کہنا شروع کر دیا۔ حالاں کہ خدا صرف ایک ہی ہے، وہ ہر مشابہت سے پاک ہے، وہی تنہا اس کا مستحق ہے کہ اس کو بڑا بنایا جائے اور اس کی عبادت کی جائے۔

رسول اللہ کے خلاف جارحیت کرنے والے مشرکین (بنو اسماعیل) بھی تھے اور اہل کتاب (بنو اسرائیل) بھی۔ مگر دونوں کے ساتھ الگ الگ معاملہ کیا گیا۔ مشرکین کے ساتھ جنگ یا اسلام کا اصول اختیار کیا گیا۔ مگر اہل کتاب کے لئے حکم ہوا کہ اگر وہ جزیہ (سیاسی اطاعت) پر راضی ہو جائیں تو انھیں چھوڑ دو۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصلاً مخاطب تھے اور اہل کتاب تبعاً۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ جس قوم پر پیغمبر کے ذریعہ براہ راست دعوت پہنچائی جاتی ہے اس سے اتمام حجت کے بعد زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے، ٹھیک ویسے ہی جیسے کسی ریاست میں ایک شخص کے باغی ثابت ہونے کے بعد اس سے زندگی کا حق چھین لیا جاتا ہے۔ مگر جہاں تک دوسرے گروہوں کا تعلق ہے ان کے ساتھ وہی سیاسی معاملہ کیا جاتا ہے جو عام بین اقوامی اصول کے مطابق درست ہو۔

وہ چاہتے ہیں کہ اللہ کی روشنی کو اپنے منھ سے بجھا دیں اور اللہ اپنی روشنی کو پورا کئے بغیر ماننے والا نہیں، خواہ کافروں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔ اسی نے اپنے رسول کو بھیجا ہے ہدایت اور دین حق کے ساتھ تاکہ اس کو سارے دین پر غالب کر دے خواہ یہ مشرکوں کو کتنا ہی ناگوار ہو ۳۳ ـ ۳۲

ان آیتوں میں خدا نے اپنے اس مستقل فیصلہ کا اعلان کیا ہے کہ وہ اپنے دین کو قیامت تک پوری طرح محفوظ رکھے گا، ماضی کی طرح اب ایسا نہیں ہونے دیا جائے گا کہ لوگ اپنی ملاوٹوں سے خدا کے دین کو گم کر دیں یا کوئی طاقت اس کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینے میں کامیاب ہو۔

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو زمین پر بسایا تو اسی کے ساتھ اس کے لئے اپنا ہدایت نامہ بھی انسان کے حوالے کر دیا۔ بعد کے دور میں جب لوگ غفلت اور دنیا پرستی میں مبتلا ہوئے تو انھوں نے خدا کے الفاظ کو بدل کر اس کو اپنی خواہشوں کے مطابق بنا لیا۔ مثلاً اپنے بزرگوں کو خدا کے یہاں سفارشی مان کر یہ عقیدہ قائم کر لیا کہ ہم جو کچھ بھی کریں، ہمارے بزرگ اپنی سفارش کے زور پر ہم کو خدا کے یہاں نجات دلا دیں گے یا یہ کہ جنت اور جہنم سب اسی دنیا میں ہیں۔ اس کے آگے اور کچھ نہیں۔ لوگ جو کچھ خود چاہتے تھے اس کو انھوں نے خدا کی طرف منسوب کر کے خدا کی کتاب میں لکھ دیا۔ اس کے بعد خدا نے دوسرا نبی بھیجا جس نے خدا کے دین کو انسانی ملاوٹوں سے الگ کر کے دوبارہ اس کو صحیح شکل میں پیش کیا۔ مگر بعد کے زمانہ میں لوگوں نے اس کو بھی بدل ڈالا۔ یہی بار بار ہوتا رہا۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے فیصلہ کیا کہ ایک آخری رسول بھیجے اور اس کے ذریعہ ایسے حالات پیدا کرے کہ خدا کا دین ہمیشہ کے لئے اپنی اصلی حالت میں محفوظ ہو جائے پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ تاریخ نبوت کا یہی عظیم کارنامہ انجام پایا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو اس وقت لوگوں نے خود ساختہ طور پر بہت سے دین بنا رکھے تھے۔ عرب کے مشرکین کا ایک دین تھا جس کو وہ دین ابراہیم کہتے تھے۔ یہود کا ایک دین تھا جس کو وہ دین موسیٰ کہتے تھے۔ نصاریٰ کا ایک دین تھا جس کو وہ دین مسیح کہتے تھے۔ یہ سب خدا کے دین کے خود ساختہ ایڈیشن تھے جن کو انھوں نے غلط طور پر خدا کی طرف سے آیا ہوا دین قرار دے رکھا تھا۔ خدا نے ان سب دینوں کو رد کر دیا اور پیغمبر عربی کے دین کو اپنے دین کے واحد مستند اڈیشن کے طور پر قیامت تک کے لئے قائم کر دیا۔

آج اسلام واحد دین ہے جس کے متن میں کوئی تبدیلی ممکن نہ ہو سکی جب کہ دوسرے تمام ادیان انسانی تحریفات کا شکار ہو کر اپنی اصلی تصویر گم کر چکے ہیں۔ اسلام واحد دین ہے جو تاریخی طور پر معتبر دین ہے جب کہ دوسرے تمام ادیان اپنے حق میں تاریخی اعتباریت کھو چکے ہیں۔ اسلام واحد دین ہے جس کی تمام تعلیمات ایک زندہ زبان میں پائی جاتی ہیں جب کہ دوسرے تمام ادیان کی ابتدائی کتابیں ایسی زبانوں میں ہیں جو اب مردہ ہو چکی ہیں۔ اسلام کی صورت میں خدا نے مذہب کی جو روشنی جلائی وہ کبھی مدھم نہیں ہوئی اور نہ بجھائی جا سکی۔ وہ کامل طور پر دنیا کے سامنے موجود ہے اور ہر دوسرے دین کے اوپر اپنی اصولی برتری کو مسلسل قائم رکھے ہوئے ہے۔

اے ایمان والو، اہل کتاب کے اکثر علماء و مشائخ لوگوں کے مال باطل طریقوں سے کھاتے ہیں اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کر کے رکھتے ہیں اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری دے دو۔ اس دن اس مال پر دوزخ کی آگ دہکائی جائے گی۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی ——— یہی ہے وہ جس کو تم نے اپنے واسطے جمع کیا تھا۔ پس اب چکھو جو تم جمع کرتے رہے ۳۵ — ۳۴

دوسرے کا مال لینے کا ایک طریقہ یہ ہے کہ اس کو حق کے مطابق لیا جائے۔ یعنی آدمی دوسرے کی کوئی واقعی خدمت کرے یا اس کو کوئی حقیقی نفع پہنچائے اور اس کے بدلے میں اس کا مال حاصل کرے۔ یہ بالکل جائز ہے۔ باطل طریقے سے دوسرے کا مال لینا یہ ہے کہ دوسرے کو دھوکے میں ڈال کر اس کا مال حاصل کیا جائے۔ یہ دوسرا طریقہ ناجائز ہے اور خدا کے غضب کو بھڑکانے والا ہے۔

باطل طریقہ سے دوسرے کا مال کھانا وہی چیز ہے جس کو موجودہ زمانہ میں استغلال (Exploitation) کہا جاتا ہے۔ یہود کے اکابر بہت بڑے پیمانہ پر اپنے عوام کا مذہبی استغلال کر رہے تھے۔ وہ عوام میں ایسی جھوٹی کہانیاں پھیلائے ہوئے تھے جس کے نتیجہ میں لوگ بزرگوں سے غیر معمولی امیدیں وابستہ کریں اور پھر ان کو بزرگ سمجھ کر ان کی برکت لینے کے لئے آئیں اور انھیں ہدیے اور نذرانے پیش کریں۔ وہ خدا کے دین کی خدمت کے نام پر لوگوں سے رقمیں وصول کرتے تھے حالاں کہ جو دین وہ لوگوں کے درمیان تقسیم کر رہے تھے وہ ان کا اپنا بنایا ہوا دین تھا نہ کہ حقیقۃً خدا کا اتارا دین۔ وہ ملت یہود کے احیار کے نام پر بڑے بڑے چندے وصول کرتے تھے حالانکہ احیار ملت کے نام پر وہ جو کچھ کر رہے تھے وہ صرف یہ تھا کہ لوگوں کو خوش خیالیوں میں الجھا کر انھیں اپنی قیادت کے لئے استعمال کرتے رہیں۔ وہ تعویذ گنڈے میں پُراسرار اوصاف بتا کر ان کو لوگوں کے ہاتھوں فروخت کرتے تھے۔ حالاں کہ ان کا حال یہ تھا کہ خود اپنے نازک معاملات میں وہ کبھی ان تعویذ گنڈوں پر بھروسہ نہیں کرتے تھے۔

آدمی کے پاس جو مال آتا ہے اس کے دو ہی جائز مصرف ہیں۔ اپنی واقعی ضرورتوں میں خرچ کرنا، اور جو کچھ واقعی ضرورت سے زائد ہو اس کو خدا کے راستہ میں دے دینا۔ اس کے علاوہ جو طریقے ہیں وہ سب آدمی کے لئے عذاب بننے والے ہیں۔ خواہ وہ اپنے مال کو فضول خرچیوں میں اڑاتا ہو یا اس کو جمع کر کے رکھ رہا ہو۔

جو لوگ یہود کی طرح خود ساختہ مذہب کی بنیاد پر کسی گروہ کے اوپر اپنی قیادت قائم کئے ہوئے ہوں اور خدا کے دین کے نام پر لوگوں کا استغلال کر رہے ہوں وہ کسی ایسی دعوت کو سخت ناپسند کرتے ہیں جو خدا کے سچے اور بے آمیز دین کو زندہ کرنا چاہتی ہو۔ ایسے دین میں انھیں اپنی مذہبی حیثیت بے اعتبار ہوتی نظر آتی ہے۔ انھیں دکھائی دیتا ہے کہ اگر اس کو عوام میں فروغ حاصل ہوا تو ان کی مذہبی تجارت بالکل بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔ وہ ایسی تحریک کے اٹھتے ہی اسے سونگھ لیتے ہیں اور اس کے مخالف بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔

مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں اللہ کی کتاب میں جس دن سے اس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا، ان میں سے چار حرمت والے ہیں۔ یہی ہے سیدھا دین۔ پس ان میں تم اپنے اوپر ظلم نہ کرو۔ اور مشرکوں سے سب مل کر لڑو جس طرح وہ سب مل کر تم سے لڑتے ہیں اور جان لو کہ اللہ متقیوں کے ساتھ ہے۔ مہینوں کا ہٹا دینا کفر میں ایک اضافہ ہے۔ اس سے کفر کرنے والے گمراہی میں پڑتے ہیں۔ وہ کسی سال حرام مہینہ کو حلال کر لیتے ہیں اور کسی سال اس کو حرام کر دیتے ہیں تاکہ خدا کے حرام کئے ہوئے کی گنتی پوری کر کے اس کے حرام کئے ہوئے کو حلال کر لیں۔ ان کے برے اعمال ان کے لئے خوش نما بنا دئے گئے ہیں۔ اور اللہ انکار کرنے والوں کو راستہ نہیں دکھاتا ۳۷ ـ ۳۶

دینی احکام پر ہر شخص الگ الگ بھی عمل کر سکتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کو یہ مطلوب ہے کہ تمام اہل ایمان ایک ساتھ ان پر عمل کریں تاکہ ان میں اجتماعیت پیدا ہو۔ اسی اجتماعیت کے مقصد کو حاصل کرنے کی خاطر عبادات کی ادائگی کے لئے متعین اوقات اور تاریخیں مقرر کی گئی ہیں۔ یہ تاریخیں اگر شمسی کیلنڈر کے اعتبار سے رکھی جائیں تو ان کے زمانہ میں یکسانیت آجاتی۔ مثلاً روزہ ہمیشہ ایک موسم میں آتا اور حج ہمیشہ ایک موسم میں۔ مگر یکسانیت آدمی کے اندر جمود پیدا کرتی ہے اور تبدیلی سے نئی قوت عمل بیدار ہوتی ہے۔ اس بنا پر دینی امور کے اجتماعی نظام کے لئے چاند کا قدرتی کیلنڈر اختیار کیا گیا۔

اسی اصول کی وجہ سے حج کی تاریخیں مختلف موسموں میں آتی ہیں، کبھی سردیوں میں اور کبھی گرمیوں میں۔ قدیم زمانہ میں جب کہ حج کا اجتماع زبردست تجارتی اہمیت رکھتا تھا، مختلف موسموں میں حج کا آنا تجارتی اعتبار سے مضر معلوم ہوا۔ اہل عرب کو دینی مصلحتوں کے مقابلہ میں دنیوی مصلحتیں زیادہ اہم نظر آئیں۔ انھوں نے چاہا کہ ایسی صورت اختیار کریں کہ حج کی تاریخ ہمیشہ ایک ہی موافق موسم میں پڑے۔ اس موقع پر یہود و نصاریٰ کا کبیسہ کا حساب ان کے علم میں آیا۔ اپنی خواہشوں کے عین مطابق ہونے کی وجہ سے وہ ان کو پسند آگیا اور انھوں نے اس کو اپنے یہاں رائج کر لیا۔ یعنی مہینوں کو ہٹا کر ایک کی جگہ دوسرے کو رکھ دینا۔ مثلاً محرم کو صفر کی جگہ کر دینا اور صفر کو محرم کی جگہ۔

نسئ کے اس طریقہ سے اہل عرب کو دو فائدے ہوئے۔ ایک یہ کہ حج کے موسم کو تجارتی تقاضے کے مطابق کر لینا۔ دوسرے یہ کہ حرام مہینوں (محرم، رجب، ذوالقعدہ، ذوالحجہ) میں کسی کے خلاف لڑائی چھیڑنا ہو تو حرام مہینہ کی جگہ غیر حرام مہینہ رکھ کر لڑائی کو جائز کر لینا۔ اہل عرب کے سامنے حضرت ابراہیم کا طریقہ بھی تھا۔ مگر ان کے ذہن پر چونکہ تجارتی مقاصد اور قبائلی تقاضوں کا غلبہ تھا۔ اس لئے ان کو نسئ کا طریقہ زیادہ اچھا معلوم ہوا اور انھوں نے اپنے معاملات کے لئے اس کو اختیار کر لیا۔

"تم بھی مل کر لڑو جس طرح وہ مل کر لڑتے ہیں" اس کا مطلب یہ ہے کہ کافر لوگ خدا سے بے خوفی پر متحد ہو جاتے ہیں، تم خدا سے خوف (تقویٰ) پر متحد ہو جاؤ۔ وہ منفی مقاصد کے لئے باہم جڑ جاتے ہیں تم مثبت مقاصد کے لئے آپس میں جڑ جاؤ۔ وہ دنیا کی خاطر ایک ہو جاتے ہیں تم آخرت کی خاطر ایک ہو جاؤ۔

اے ایمان والو، تم کو کیا ہو گیا ہے کہ جب تم سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی راہ میں نکلو تو تم زمین سے لگے جاتے ہو۔ کیا تم آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی پر راضی ہو گئے۔ آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی کا سامان تو بہت تھوڑا ہے۔ اگر تم نہ نکلو گے تو خدا تم کو دردناک سزا دے گا اور تمھاری جگہ دوسری قوم لے آئے گا اور تم خدا کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔ اگر تم رسول کی مدد نہ کرو گے تو اللہ خود اس کی مدد کر چکا ہے جب کہ کافروں نے اس کو نکال دیا تھا، وہ صرف دو میں کا دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غم نہ کرو، اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پس اللہ نے اس پر اپنی سکینت نازل فرمائی اور اس کی مدد ایسے لشکروں سے کی جو تم کو نظر نہ آتے تھے اور اللہ نے کافروں کی بات نیچی کر دی اور اللہ ہی کی بات تو اونچی ہے اور اللہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۴۰ — ۳۸

یہ آیتیں غزوہ تبوک (۹ ھ) کے ذیل میں اتریں۔ اس موقع پر مدینہ کے منافقین کی طرف سے جو عمل ظاہر ہوا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کمزور ایمان والے لوگ جب کسی اسلامی معاشرہ میں داخل ہو جاتے ہیں تو نازک مواقع پر ان کا کردار کیا ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اسلام سے تعلق کے دو درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اسی سے آدمی کی تمام وفاداریاں وابستہ ہو جائیں۔ وہ آدمی کے لئے زندگی و موت کا مسئلہ بن جائے۔ دوسرے یہ کہ آدمی کی حقیقی دلچسپیاں تو کہیں اور اٹکی ہوئی ہوں اور اوپری طور پر وہ اسلام کا اقرار کر لے۔ پہلی قسم کے لوگ سچے مومن ہیں اور دوسری قسم کے لوگ وہ ہیں جن کو شریعت کی اصطلاح میں منافق کہا گیا ہے۔ مومن کا حال یہ ہوتا ہے کہ عام حالات میں بھی وہ اسلام کو پکڑے ہوئے ہوتا ہے اور قربانی کے لمحات میں بھی وہ پوری طرح اس پر قائم رہتا ہے۔ اس کے برعکس منافق کا حال یہ ہوتا ہے کہ وہ بے ضرر اسلام یا نمائشی دینداری میں تو بہت آگے دکھائی دیتا ہے۔ مگر جب قربانی کی سطح پر اسلام کے تقاضوں کو اختیار کرنا ہو تو وہ پیچھے ہٹ جاتا ہے۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ مومن کے سامنے اصلاً آخرت ہوتی ہے اور منافق کے سامنے اصلاً دنیا۔ مومن آخرت کی بے پایاں نعمتوں کے مقابلہ میں دنیا کی کوئی قیمت نہیں سمجھتا، اس لئے جب بھی دنیا کی چیزوں میں سے کوئی چیز اس کے راستہ میں حائل ہو تو وہ اس کو نظر انداز کر کے دین کی طرف بڑھ جاتا ہے۔ اس کے برعکس منافق ایسے اسلام کو پسند کرتا ہے جس میں دنیا کو بگاڑے بغیر اسلامیت کا کریڈٹ مل رہا ہو۔ اس لئے جب ایسا موقع آتا ہے کہ دنیا کو کھو کر اسلام کو پانا ہو تو وہ دنیا کی طرف جھک جاتا ہے، خواہ اس کے نتیجہ میں اسلام کی رسی اس کے ہاتھ سے نکل جائے۔

اسلام اور غیر اسلام کی کش مکش کے جو لمحات موجودہ دنیا میں آتے ہیں وہ بظاہر دیکھنے والوں کو اگرچہ دو انسانی گروہوں کی کش مکش دکھائی دیتی ہے مگر اپنی حقیقت کے اعتبار سے یہ ایک خدائی معاملہ ہوتا ہے۔ ایسے ہر موقع پر خود خدا اسلام کی طرف سے کھڑا ہوتا ہے۔ ایسے کسی واقعہ کو اسباب کے روپ میں اس لئے ظاہر کیا جاتا ہے تاکہ ان لوگوں کو خدمت دین کا کریڈٹ دیا جائے جو اپنے آپ کو پوری طرح خدا کے حوالے کر چکے ہیں۔

ہلکے اور بوجھل اور اپنے مال اور اپنی جان سے اللہ کی راہ میں جہاد کرو، یہ تمھارے لئے بہتر ہے اگر تم جانو۔ اگر نفع قریب ہوتا اور سفر ہلکا ہوتا تو وہ ضرور تمھارے پیچھے ہو لیتے مگر یہ منزل ان پر کٹھن ہو گئی۔ اب وہ قسمیں کھائیں گے کہ اگر ہم سے ہو سکتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے کہ یہ لوگ یقیناً جھوٹے ہیں ۴۲ — ۴۱

مدینہ کے جن لوگوں کو منافق کہا گیا وہ کوئی جاسوس نہ تھے بلکہ کمزور عقیدہ کے مسلمان تھے۔ انھوں نے اسلام کو حق سمجھ کر اس کا اقرار کیا تھا۔ وہ اسلام کی ان تمام تعلیمات پر عمل کرتے تھے جو ان کی دنیوی مصلحتوں کے خلاف نہ ہوں۔ مگر جب اسلام کا تقاضا ان کے دنیوی تقاضوں سے ٹکراتا تو ایسے موقع پر وہ اسلامی تقاضے کو چھوڑ کر اپنے دنیوی تقاضے کو پکڑ لیتے۔ مدینہ کے معاشرہ میں مومن اس شخص کا نام تھا جو قربانی کی سطح پر اسلام کو اختیار کئے ہوئے ہو اور منافق وہ تھا جو اسلام کی خاطر قربانی کی حد تک جانے کے لئے تیار نہ ہو۔

تبوک کا معاملہ ایک علامتی تصویر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی نظر میں مومن کون ہوتا ہے اور منافق کون۔ اس موقع پر روم جیسی بڑی اور منظم طاقت سے مقابلہ کے لئے نکلنا تھا۔ زمانہ شدید گرمی کا تھا۔ فصل بالکل کاٹنے کے قریب پہنچ چکی تھی۔ ہر قسم کی ناسازگاری کا مقابلہ کرتے ہوئے شام کی دور دراز سرحد پر پہنچنا تھا۔ پھر مسلمانوں میں کچھ سامان والے تھے اور کچھ بے سامان والے۔ کچھ آزاد تھے اور کچھ اپنے حالات میں گھرے ہوئے تھے۔ مگر حکم ہوا کہ ہر حال میں نکلو، کسی بھی چیز کو اپنے لئے عذر نہ بناؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خدا کے یہاں اصل مسئلہ مقدار کا نہیں ہوتا بلکہ یہ ہوتا ہے کہ آدمی کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ اس کو پیش کر دے۔ یہی دراصل جنت کی قیمت ہے، خواہ وہ بظاہر دیکھنے والوں کے نزدیک کتنی ہی کم کیوں نہ ہو۔

منافق کی خاص پہچان یہ ہے کہ اگر وہ دیکھتا ہے کہ بے مشقت سفر کر کے خدمت اسلام کا ایک بڑا کریڈٹ مل رہا ہے تو وہ فوراً ایسے سفر کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر ایسا سفر درپیش ہو جس میں مشقتیں ہوں اور سب کچھ کر کے بھی بظاہر کوئی عزت اور کامیابی ملنے والی نہ ہو تو ایسی دینی مہم کے لئے اس کے اندر رغبت پیدا نہیں ہوتی۔

ایک حقیقی دینی مہم سامنے ہو اور آدمی عذرات پیش کر کے اس سے الگ رہنا چاہے تو یہ صاف طور پر اس بات کا ثبوت ہے کہ آدمی نے خدا کے دین کو اپنی زندگی میں سب سے اونچا مقام نہیں دیا ہے۔ عذر پیش کرنے کا مطلب ہی یہ ہے کہ پیش نظر مقصد کے مقابلہ میں کوئی اور چیز آدمی کے نزدیک زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا عذر کسی آدمی کو خدا کی نظر میں بے اعتبار ثابت کرنے والا ہے نہ یہ کہ اس کی بنا پر اس کو مقبولین کی فہرست میں شامل کیا جائے۔ منافقت دراصل خدا سے بے پروا ہو کر بندوں کی پروا کرنا ہے۔ آدمی اگر خدا کی قدرت کو جان لے تو وہ کبھی ایسا نہ کرے۔

اللہ تم کو معاف کرے، تم نے کیوں انھیں اجازت دے دی۔ یہاں تک کہ تم پر کھل جاتا کہ کون لوگ سچے ہیں اور جھوٹوں کو بھی تم جان لیتے۔ جو لوگ اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں وہ کبھی تم سے یہ درخواست نہ کریں گے کہ وہ اپنے مال اور اپنی جان سے جہاد نہ کریں اور اللہ ڈرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ تم سے اجازت تو وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے اور ان کے دل شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ پس وہ اپنے شک میں بھٹک رہے ہیں۔ اور اگر وہ نکلنا چاہتے تو ضرور وہ اس کا کچھ سامان کر لیتے۔ مگر اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہ کیا اس لئے انھیں جمار ہنے دیا اور کہہ دیا گیا کہ بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ۴۴ — ۴۶

منافق وہ ہے جو اسلام کے نفع بخش یا بے ضرر پہلوؤں میں آگے آگے رہے مگر جب اس کے مفادات پر زد پڑتی نظر آئے تو وہ پیچھے ہٹ جائے۔ ایسے مواقع پر اس قسم کے کمزور لوگ جس چیز کا سہارا لیتے ہیں وہ عذر ہے۔ وہ اپنی بے عملی کو خوبصورت توجیہات میں چھپانے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا سربراہ اگر اجتماعی مصالح کے پیش نظر ان کے عذر کو قبول کرلے تو وہ خوش ہوتے ہیں کہ انھوں نے اپنے الفاظ کے پردے میں نہایت کامیابی کے ساتھ اپنی بے عملی کو چھپالیا۔ مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ اصل معاملہ انسان سے نہیں بلکہ خدا سے ہے۔ اور وہ ہر آدمی کی حقیقت کو اچھی طرح جانتا ہے۔ خدا ایسے لوگوں کا راز کبھی دنیا میں کھول دیتا ہے اور آخرت میں تو بہر حال ہر ایک کا راز کھولا جانے والا ہے۔

کسی کا لڑکا بیمار ہو یا کسی کی لڑکی کی شادی ہو تو اس وقت وہ اپنے آپ کو اور اپنے مال کو اس سے بچا کر نہیں رکھتا۔ اس کی زندگی اور اس کا مال تو اسی لئے ہے کہ ایسا کوئی موقع آئے تو وہ اپنا سب کچھ نثار کر کے ان کے کام آسکے۔ ایسا کوئی وقت اس کے لئے بڑھ کر قربانی دینے کا ہوتا ہے نہ کہ عذرات کی آڑ تلاش کرنے کا۔ یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ جو شخص اپنے دین میں سنجیدہ ہو وہ دین کے لئے قربانی کا موقع آنے پر کبھی عذر تلاش نہیں کرے گا۔ اس کے سینہ میں جو ایمانی جذبات بے قرار تھے وہ تو گویا اسی دن کے انتظار میں تھے کہ جب کوئی موقع آئے تو وہ اپنے آپ کو نثار کر کے خدا کی نظر میں اپنے کو وفادار ثابت کر سکے۔ پھر ایسا موقع پیش آنے پر وہ عذر کا سہارا کیوں ڈھونڈے گا۔

مومن خدا سے ڈرنے والا ہوتا ہے اور ڈر کا جذبہ آدمی کے اندر سب سے زیادہ قوی جذبہ ہے۔ ڈر کا جذبہ دوسرے تمام جذبات پر غالب آجاتا ہے۔ جس چیز سے آدمی کو ڈر اور اندیشہ کا تعلق ہو اس کے بارے میں وہ آخری حد تک سنجیدہ اور حقیقت پسند ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی شخص ڈر کی سطح پر خدا کا مومن بن جائے تو اس کو یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگتی کہ کس موقع پر اسے کس قسم کا ردعمل پیش کرنا چاہئے۔

آخرت کا نفع سامنے نہ ہونے کی وجہ سے آدمی اس کے لئے قربانی دینے میں شک میں پڑ جاتا ہے۔ مگر اس شک کے پردہ کو پھاڑنا ہی اس دنیا میں آدمی کا اصل امتحان ہے۔

اگر یہ لوگ تمھارے ساتھ نکلتے تو وہ تمھارے لئے خرابی ہی بڑھانے کا باعث بنتے اور وہ تمھارے درمیان فتنہ پردازی کے لئے دوڑ دھوپ کرتے اور تم میں ان کی سننے والے ہیں اور اللہ ظالموں سے خوب واقف ہے۔ یہ پہلے بھی فتنہ کی کوشش کر چکے ہیں اور وہ تمھارے لئے کاموں کا الٹ پھیر کرتے رہے ہیں۔ یہاں تک کہ حق آگیا اور اللہ کا حکم ظاہر ہوگیا اور وہ ناخوش ہی رہے ۴۸ — ۴۷

دین کو اختیار کرنا ایک مخلصانہ ہوتا ہے اور دوسرا منافقانہ، مخلصانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین کے مسئلہ کو آدمی اپنی زندگی کا مسئلہ بنائے، اپنی زندگی اور اپنے مال پر وہ سب سے زیادہ دین کا حق سمجھے۔ اس کے برعکس منافقانہ طور پر دین کو اختیار کرنا یہ ہے کہ دین سے بس رسمی اور ظاہری تعلق رکھا جائے۔ دین کو آدمی اپنی زندگی میں یہ مقام نہ دے کہ اس کے لئے وہ وقف ہو جائے اور ہر قسم کے نقصان کا خطرہ مول لے کر اس کی راہ میں آگے بڑھے۔

اپنی غلطی کو ماننا اپنے کو دوسرے کے مقابلہ میں کمتر تسلیم کرنا ہے اور اس قسم کا اعتراف کسی آدمی کے لئے مشکل ترین کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آدمی ہمیشہ اس کوشش میں رہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اپنے موقف کو صحیح ثابت کر دے۔ چنانچہ منافقانہ طور پر اسلام کو اختیار کرنے والے ہمیشہ اس تلاش میں رہتے ہیں کہ کوئی موقع ملے تو مخلص مومنوں کو مطعون کریں اور ان کے مقابلہ میں اپنے آپ کو زیادہ درست ثابت کر سکیں۔

مدینہ کے منافقین مسلسل اس کوشش میں رہتے تھے۔ مثلاً غزوۂ احد میں مسلمانوں کو شکست ہوئی تو مدینہ میں بیٹھ رہنے والے منافقین نے رسول اللہ ﷺ کے خلاف یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ ان کو معاملات جنگ کا تجربہ نہیں ہے۔ انھوں نے جوش کے تحت اقدام کیا اور ہماری قوم کے جوانوں کو غلط مقام پر لے جا کر خواہ مخواہ کٹوا دیا

انسانوں میں کم لوگ ایسے ہوتے ہیں جو مسائل کا گہرا تجزیہ کر سکیں اور اس حقیقت کو جانیں کہ کسی بات کا قواعد زبان کے اعتبار سے صحیح الفاظ میں ڈھل جانا اس کا کافی ثبوت نہیں ہے کہ وہ بات معنی کے اعتبار سے بھی صحیح ہوگی۔ بیشتر لوگ سادہ فکر کے ہوتے ہیں اور کوئی بات خوبصورت الفاظ میں کہی جائے تو بہت جلد اس سے متاثر ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر کسی مسلم گروہ میں منافق قسم کے افراد کی موجودگی ہمیشہ اس گروہ کی کمزوری کا باعث ہوتی ہے۔ یہ لوگ اپنے کو درست ثابت کرنے کی کوشش میں اکثر ایسا کرتے ہیں کہ باتوں کو غلط رخ دے کر ان کو اپنے مفید مطلب رنگ میں بیان کرتے ہیں۔ اس سے سادہ فکر کے لوگ متاثر ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر غیر ضروری طور پر شبہ اور بے یقینی کی کیفیت پیدا ہونے لگتی ہے۔

منافقین کی مخالفانہ کوششوں کے باوجود جب بدر کی فتح ہوئی تو عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے کہا: إِنَّ هٰذَا أَمْرٌ قَدْ تَوَجَّهَ۔ یعنی یہ چیز تو اب چل نکلی۔ اسلام کا غلبہ ظاہر ہونے کے بعد انھیں اسلام کی صداقت پر یقین کرنا چاہئے تھا مگر اس وقت بھی انھوں نے اس سے حسد کی غذا لی۔

کل کو یاد رکھئے

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ ہم آخرت کے مسافر ہیں۔ ہماری موجودہ زندگی ہماری اصل زندگی کا بہت چھوٹا حصہ ہے۔ ہم بہت جلد اپنی مستقل زندگی کے مرحلہ میں داخل ہونے والے ہیں۔ اس حقیقت واقعہ کو یاد رکھنا اور آج کی دنیا کے نفع نقصان کے بجائے آنے والی ابدی دنیا کے نفع نقصان کو سامنے رکھ کر زندگی گزارنا، اسی کا نام دین یا اسلامی زندگی ہے۔

دوسروں کے مقابلہ میں آپ کو کوئی بڑائی یا عزت مل جائے تو دوسروں کو حقیر نہ سمجھئے۔ کیونکہ بڑے اور چھوٹے دونوں بالآخر برابر ہو جانے والے ہیں۔ اس کے بعد بڑائی اسی کے لئے ہوگی جس کو خدا بڑا بنائے اور چھوٹا وہ ہوگا جو خدا کے نزدیک چھوٹا قرار پائے۔

کسی نے اپنی دنیوی زندگی کو کامیاب بنا لیا ہو تو اکثر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ اس کی آخرت بھی ضرور کامیاب رہے گی۔ حالاں کہ دونوں میں کوئی لازمی تعلق نہیں۔

اگر لوگوں کو معلوم ہو کہ کل ان کا کیا انجام ہونے والا ہے تو ان کا آج ان کے لئے بے لذت ہو جائے۔ یہ آنے والے کل سے بے خبری ہے جس نے لوگوں کے آج کو ان کے لئے لذیذ بنا رکھا ہے۔

جب کسی سے معاملہ پڑتا ہے تو آدمی ایک جواب دے کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو احساس ہو کہ آخری جواب کسی انسان کو نہیں بلکہ خدا کو دینا ہے تو وہ بولنے کے بجائے چپ رہنا پسند کرے۔

آج لوگوں کے لئے سب سے آسان کام بولنا ہے اور سب سے مشکل کام چپ رہنا۔ مگر بہت جلد وہ دن آنے والا ہے جب کہ بولنا اتنا سنگین کام معلوم ہوگا کہ لوگ سوچیں گے کہ کاش وہ ساری عمر چپ رہتے، کاش انھوں نے اپنے ہونٹوں کو سی لیا ہوتا۔

ہر آدمی اپنے آج میں الجھا ہوا ہے، کسی کو اپنے کل کی خبر نہیں۔ حالاں کہ موت ہر روز ہمارے آج کو باطل کر کے یہ ثابت کر رہی ہے کہ آج کی اور آج کی چیزوں کی اس کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں۔

حرار ـــــ فطرت کا مطالعہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آغاز نبوت کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام لکھتے ہیں: اللہ نے جب ارادہ کیا کہ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت کے منصب پر مقرر کرے تو آپ کا یہ حال ہوا کہ جب آپ اپنی کسی ضرورت کے لئے بستی سے نکلتے تو بہت دور چلے جاتے، یہاں تک کہ مکانات نظر نہ آتے۔ آپ مکہ کی پہاڑیوں اور وادیوں میں کھو جاتے۔ ابن ہشام نے عبداللہ بن زبیر کی روایت نقل کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہر سال میں ایک مہینہ حرار پہاڑ میں چلے جاتے اور اس کے پڑوس میں رہتے (کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یجاور فی حراء من کل سنة شهراً) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ابوطالب کے کچھ اشعار ابن ہشام نے نقل کئے ہیں۔ ایک مصرعہ یہ ہے:

وَرَاقٍ لِيَرْقَىٰ فِي حِرَارٍ وَنَازِلِ

(وہ حرار پر چڑھنے والے ہیں اور پھر اس سے اترنے والے ہیں)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اندر جب حقیقت کی تلاش کا جذبہ ابھرا تو آپ کا یہ حال ہوا کہ انسانی بستیوں سے نکل کر آپ پہاڑی علاقوں میں چلے جاتے۔ یہ گویا ایک صالح روح کا واقعات انسانی کا ماحول چھوڑ کر واقعات خداوندی کے ماحول میں جانا تھا ـــــ صحرائی جغرافیہ خصوصیت سے اس کام کے لئے موزوں ترین جگہ ہوتی ہے۔

رومانیہ کے مستشرق کونستان ورژیل جارج (-۱۹۱۶) نے اسلام کے جغرافیہ کو سمجھنے کے لئے خود عرب کا سفر کیا تھا۔ وہ اپنی کتاب "پیغمبر اسلام" میں لکھتے ہیں:

جب تک کوئی انسان عرب اور مشرق کے جنگلوں میں ایک مدت نہ گزارے، وہ اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا کہ صحرا کی وسعت اور اس کا سکوت کس طرح فکر انسانی کی وسعت کا سبب ہوتا ہے اور خیال کو تقویت دیتا ہے۔ عرب کی گھاس اور یورپ کی گھاس میں بہت فرق ہے۔ گرم جنگلوں میں کوئی گھاس ایسی نہیں جس میں خوشبو نہ ہو۔ یہاں تک کہ عرب جنگلوں کے ببول بھی خوشبو دار ہیں۔ ۳۰ لاکھ کیلو میٹر والا مسطح جنگل اور گرم عربستان ایسی جگہ ہے جہاں انسان گویا بلا واسطہ خدا تک پہنچ جاتا ہے۔

دوسرے ملک ایسی عمارت کے مثل ہیں جن کے درمیان بڑی بڑی دیواریں حائل ہیں۔ مگر عرب کے جنگلوں میں ایسا کوئی مانع نہیں جو دیدار حق کو روک سکے۔ لوگ جس طرف بھی نظر ڈالتے ہیں، لامحدود جنگل اور بے کنار آسمان انھیں دکھائی دیتا ہے۔ یہاں خدا اور فرشتوں کی شناسائی کے لئے کوئی چیز مانع نہیں۔

برتر اخلاقیات

قرآن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں ارشاد ہوا ہے : انّكَ لعلىٰ خُلُقٍ عظيم (تم ایک اعلیٰ کردار پر ہو) امام عطیہ نے خُلُقٍ عظیم کی تفسیر ادبِ عظیم سے کی ہے (تفسیر ابن کثیر) یہ بلند اخلاق اور اعلیٰ کردار کیا ہے، اس کی وضاحت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقوال سے ہوتی ہے :

عن حذيفة قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم لا تكونوا إمّعةً تقولون إن أحسنَ الناسُ أحسنّا وإن أساؤا ظلمنا ولكن وطّنوا انفسكم إن احسنَ الناسُ أن تحسنوا وإن اساؤا فلا تظلموا (مشکوٰۃ باب الظلم)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم لوگ اِمّعہ نہ بنو، یہ کہنے لگو کہ لوگ اچھا سلوک کریں گے تو ہم بھی اچھا سلوک کریں گے۔ اور لوگ برا کریں گے تو ہم بھی ان کے ساتھ ظلم کریں گے۔ بلکہ اپنے آپ کو اس کا خوگر بناؤ کہ لوگ اچھا سلوک کریں تب بھی تم اچھا سلوک کرو اور لوگ برا سلوک کریں تو تم ان کے ساتھ ظلم نہ کرو۔

قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: صِل مَن قطعك واعفُ عمّن ظلمك واحسن الىٰ من اساءَ إليك

جو تم سے کٹے تم اس سے جُڑو۔ جو تم پر ظلم کرے تم اس کو معاف کر دو اور جو تمہارے ساتھ برا سلوک کرے تم اس کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔

یہ اعلیٰ اخلاق جو حدیث میں بتایا گیا ہے اس اخلاق میں آپ بلند ترین مرتبہ پر تھے۔ عام مسلمانوں سے یہ اعلیٰ اخلاق عزیمت کے درجہ میں مطلوب ہے مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے یہ لازم تھا۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے میرے رب نے حکم دیا ہے کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں، جو مجھ کو نہ دے میں اسے دوں۔ جو مجھ پر ظلم کرے میں اسے معاف کر دوں (امرني ربي بتسع ۔ ۔ ۔ وان اصل من قطعني واعطي من حرمني واعفو عمن ظلمني)

اخلاق کی دو سطحیں ہیں۔ ایک معمولی سطح اور دوسری برتر سطح۔ اخلاق کی معمولی سطح یہ ہے کہ آدمی کا اخلاق جوابی اخلاق ہو "جو مجھ سے جیسا کرے گا میں بھی اس کے ساتھ ویسا ہی کروں گا" یہ اس کا اصول ہو جو شخص اس سے کٹے وہ بھی اس سے کٹ جائے۔ جو شخص اس پر ظلم کرے وہ بھی اس پر ظلم کرنے لگے۔ جو شخص اس کے ساتھ برائی کرے وہ بھی اس کے لئے برا بن جائے۔

یہ عام اخلاق ہے۔ اس کے مقابلہ میں برتر اخلاق یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے رویہ کی پروا کئے بغیر اپنا رویہ متعین کرے۔ اس کا اخلاق اصولی ہو نہ کہ جوابی۔ اعلیٰ اخلاقیات اس کا ایک عام اصول ہو جس کو وہ ہر جگہ برتے، خواہ معاملہ موافق کے ساتھ ہو یا مخالف کے ساتھ۔ وہ جُڑنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس سے قطع تعلق کرے۔ وہ بہتر سلوک کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس کے ساتھ بھی جو اس سے برا سلوک کرے۔ وہ نظر انداز کرنے والا ہو حتیٰ کہ اس سے بھی جو اس پر ظلم کرتا ہو۔

مقام عبدیت

عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے۔ خلافت کے زمانہ میں ایک روز وہ اپنے گھر پر تھے اور معمولی گھریلو کام کر رہے تھے جو عام طور پر خادموں کے کرنے کا ہوتا ہے۔ عین اس وقت عرب کے کچھ بڑے لوگ آپ سے ملاقات کے لئے آئے۔ خلیفۂ وقت کو ایک معمولی کام میں مشغول دیکھ کر انھوں نے کہا: آپ نے کسی عبد (غلام) سے یہ کام لے لیا ہوتا۔ حضرت عمر نے یہ سن کر فرمایا: اَیُّ عَبْدٍ اَعْبَدُ مِنِّیْ (مجھ سے زیادہ غلام اور کون ہو سکتا ہے)

حضرت عمر کا یہ جواب بتاتا ہے کہ جو کام وہ کر رہے تھے وہ ان کے لئے محض ایک خشک کام نہ تھا بلکہ ان کی روح اس میں لذت پا رہی تھی۔ انکساری اگر نمائشی نہ ہو بلکہ حقیقی ہو تو وہ آدمی کے لئے لذیذ ترین چیز ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنی اصلی حیثیت کا اعتراف ہوتی ہے۔ بندہ جب تواضع اور انکساری کی حالت میں ہوتا ہے تو وہ خدا کے قریب ترین ہوتا ہے۔ کیونکہ خدا کے دربار میں کسی بندہ کے لئے جو سب سے قریبی نشست ہے وہ تواضع ہی ہے۔ اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ بندہ اپنے رب سے اس وقت سب سے زیادہ قریب ہوتا ہے جب کہ وہ سجدہ میں ہوتا ہے (اقرب ما یکون العبد من ربہ وھو ساجد، رواہ مسلم)

شعوری سجدہ پستی اور بے نفسی کی آخری حالت ہے۔ بندہ جب حقیقی سجدہ میں ہو تو وہ اس قریب ترین مقام پر ہوتا ہے جہاں کوئی انسان خدا کی بارگاہ میں پہنچ سکتا ہے۔

لوگوں کو عبدیت کے مقام کی خبر نہیں، یہی وجہ ہے کہ عبدیت ان کے لئے لذیذ چیز نہیں بنی۔ لوگ امتیاز میں جیتے ہیں پھر مساوات کی لذت کو وہ کس طرح پائیں۔ لوگ اپنی انا میں جیتے ہیں پھر خدا کی کبریائی کے اعتراف کی لذت انھیں کیسے ملے۔ لوگ دوسروں کو غلط ثابت کر کے خوش ہونا چاہتے ہیں پھر انھیں اپنی غلطی کو جاننے اور ماننے کی خوشی کیسے حاصل ہو۔ لوگ اپنے کو ایک پیمانہ سے ناپتے ہیں اور دوسروں کو دوسرے پیمانہ سے پھر وہ کیسے جانیں کہ اپنے لئے اور دوسروں کے لئے ایک پیمانہ رکھنا اتنی بڑی دولت ہے کہ دنیا کی تمام دولتیں اس پر قربان کی جا سکتی ہیں۔

مومن وہ ہے جس کے لئے دینی عمل ہی سب سے بڑی لذت بن جائے۔ صرف ذکر اور عبادت کے معاملہ میں نہیں بلکہ ہر معاملہ میں۔ حسد کے جذبات کو کچلنا، انتقام کی آگ کو بجھانا، گروہی عصبیت سے اپنے کو اوپر اٹھانا، اختلاف کے باوجود انصاف کرنا، خوشامد کے بجائے حق کی بنیاد پر انسان کی قدر کرنا، یہ سب چیزیں اس کے لئے اس طرح لذیذ بن جائیں کہ ان کو چھوڑنا اس کے لئے ممکن نہ ہو۔

الفاظ کم ہو جاتے ہیں

مسٹر لزلی براؤن شمالی انگلستان کے ایک ٹرک ڈرائیور ہیں۔ وہ اولاد سے محروم تھے۔ ان کی بیوی کے جسمانی نظام میں بعض حیاتیاتی فرق کی وجہ سے دونوں کا مادۂ حیات رحم مادر میں یک جا نہیں ہوتا تھا۔ وہ اولاد کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے کہ عین وقت پر سائنس نے ان کی مدد کی۔ لندن کے ڈاکٹر پیٹرک اسٹپٹو جو برسہا برس سے اس میدان میں تجربہ کر رہے تھے انھوں نے اپنی لیبورٹری میں لزلی براؤن کا مادۂ تولید (اسپرم) نکالا اور مسز براؤن کے جسم سے ایک بیضہ لیا۔ دونوں کو انھوں نے ایک خصوصی قسم کے ٹسٹ ٹیوب میں رکھا۔ قدرتی قانون کے تحت وہ دونوں مل کر زرخیز ہو گئے۔ چار روز کے بعد ڈاکٹر نے اس کو مصنوعی طور پر رحم مادر میں پہنچا دیا۔ اب رحم مادر میں اس "بچہ" کی پرورش ہونے لگی۔ تجربہ کامیاب رہا۔ اگست ۱۹۷۸ میں تاریخ کا پہلا "ٹسٹ ٹیوب بے بی" وجود میں آگیا۔ اس پورے عمل کی تصویر لی جاتی رہی، اور پیدائش کے بعد اس کو مکمل طور پر ٹیلی وژن پر دکھایا گیا۔

ٹیوب بے بی (لوئی براؤن) کے باپ سے اس پورے واقعہ پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو اس نے کہا "بیوٹی فل" یعنی بے حد حسین۔ اس ایک لفظ کے سوا وہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

غم کی گھٹنا خوشی سے زیادہ بڑی گھٹنا ہوتی ہے۔ انڈین نیوی کے ایک افسر کی اہلیہ مسز ادما چوپڑہ کو ۲۶ اگست ۱۹۷۸ کو جب معلوم ہوا کہ ان کے دونوں بچے گیتا (۱۷) اور سنجے (۱۵) کو نئی دہلی میں وحشیانہ طور پر کسی نے قتل کر دیا ہے تو اس کے بعد ان کا یہ حال ہوا کہ سات گھنٹے تک وہ ایک لفظ نہ بول سکیں۔

حقیقت یہ ہے کہ تاثر جتنا شدید ہو الفاظ اتنا ہی کم ہو جاتے ہیں۔ بے حد خوشی ہو تب بھی آدمی زیادہ بول نہیں پاتا اور بے حد غم ہو تب بھی زیادہ بولنا آدمی کے لئے ممکن نہیں رہتا۔ جو لوگ دین و ملت کے "غم" میں ہر روز الفاظ کے دریا بہاتے رہتے ہیں وہ صرف اس بات کا ثبوت دے رہے ہیں کہ دین و ملت کے غم میں وہ سب سے پیچھے ہیں۔ جو شخص درد و غم میں مبتلا ہو اس کو تو چپ لگ جاتی ہے نہ یہ کہ وہ لفظی اکھاڑوں میں لسانی پہلوانی کے کرتب دکھانے لگے۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگوں نے خدا کو نہ اس کے منعم کے روپ میں پایا ہے اور نہ منتقم کے روپ میں۔ اگر وہ دونوں میں سے کسی روپ میں بھی خدا کو پا لیتے تو یہ صورت باقی نہ رہتی کہ ہر آدمی ایسے الفاظ کا بھنڈار بنا ہوا ہے جو کسی طرح ختم ہونے میں نہیں آتے۔

دنیا اور آخرت

انسان کی سب سے بڑی طلب کیا ہے۔ یہ کہ اس کو خوشیوں سے بھری ہوئی ایک زندگی حاصل ہو۔ یہی ہر زمانہ میں آدمی کا سب سے بڑا خواب رہا ہے۔ ہر آدمی اسی تمنا کو لے کر جیتا ہے۔ مگر ہر آدمی اس تمنا کی تکمیل کے بغیر مرجاتا ہے۔ سارے فلسفے اور نظریات، تمام انسانی کوششیں اسی ایک چیز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ مگر آج تک انسان نہ فکری طور پر اس کو دریافت کرسکا اور نہ عملی طور پر اس منزل تک پہنچنے میں کامیاب ہوسکا۔

اس ناکامی کی وجہ صرف ایک ہے۔ تمام لوگ اپنے خواب کی تعبیر اسی موجودہ دنیا میں پانا چاہتے ہیں۔ مگر ہزاروں برس کے تجربہ نے صرف ایک چیز ثابت کی ہے۔ یہ کہ موجودہ دنیا اس آرزو کی تکمیل کے لئے ناکافی ہے۔ موجودہ دنیا کی محدودیت، موجودہ دنیا میں انسانی آزادی کا غلط استعمال انتہائی فیصلہ کن طور پر اس میں مانع ہے کہ موجودہ دنیا انسانی خوابوں کی تعبیر بن سکے۔

ہم زندگی کو کامیاب بنانے کی طرف ابھی سفر کر رہے ہوتے ہیں کہ ہم کو موت آجاتی ہے۔ ہم مشینی ترقیاں وجود میں لاتے ہیں مگر صنعتی مسائل پیدا ہوکر ساری ترقی کو بے معنی بنا دیتے ہیں۔ ہم بے پناہ قربانیاں کر کے ایک سیاسی نظام کو وجود میں لاتے ہیں مگر اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے والوں کا بگاڑ اس کو عملاً بے نتیجہ بنا دیتا ہے۔ ہم اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنانے کی کوشش کرتے ہیں مگر دوسرے انسانوں کا بغض، حسد، گھمنڈ، ظلم اور انتقام ظاہر ہوکر ہم کو الجھا لیتا ہے اور ہم اپنے آشیانہ کو خود اپنی آنکھوں سے بکھرتا ہوا دیکھ کر اس دنیا سے چلے جاتے ہیں۔

یہ مسلسل تجربات ثابت کرتے ہیں کہ ہمارے خوابوں کی دنیا موجودہ زمینی حالات میں نہیں بن سکتی۔ اس کے لئے دوسری دنیا اور دوسرے حالات درکار ہیں۔ آدمی کی تمنائیں بجائے خود ایک حقیقی انسانی طلب ہیں۔ مگر اس طلب کی تکمیل کی جگہ موت کے بعد آنے والی اگلی دنیا ہے نہ کہ موت سے پہلے کی موجودہ دنیا۔

یہی واحد چیز ہے جو ہماری دنیا کی زندگی کو بامعنی بناتی ہے۔ اس کے بعد موجودہ دنیا جدوجہد کی دنیا بن جاتی ہے اور اگلی دنیا جدوجہد کا انجام پانے کی دنیا۔ اس کے بعد آدمی اپنی وہ منزل پالیتا ہے جس کی طرف وہ مطمئن ہوکر بڑھ سکے۔ موجودہ دنیا کو منزل سمجھنے کی صورت میں آدمی بالآخر مایوسی اور انتشار ذہنی کے سوا اور کہیں نہیں پہنچتا۔ جب کہ آخرت کی دنیا کو منزل سمجھنے کا عقیدہ اس کے سامنے ابدی سکون کا دروازہ کھول دیتا ہے۔ ایک ایسی دنیا جہاں کھونے کے سوا اور کچھ نہ ہو وہاں وہی نظریہ صحیح ہوسکتا ہے جو کھونے میں پانے کا راز بتا رہا ہو۔

کیسا عجیب

کرناٹک کے گورنر مسٹر گووند نرائن کی لڑکی نندنی کی عمر ابھی صرف ۳۸ سال تھی کہ ۱۶ ستمبر ۱۹۸۱ کو نئی دہلی میں اس کا انتقال ہوگیا۔ ایک ہنستی ہوئی زندگی اچانک خاموش ہوگئی۔

نندنی بہت ذہین اور تندرست تھی۔ اس کی تعلیم خالص انگریزی طرز پر ہوئی۔ اس کے بعد اس نے امریکہ سے جرنلزم (صحافت) کی ڈگری حاصل کی۔ وہ ہندستان ٹائمس میں سینیر رپورٹر تھی۔ اپنی مختلف خصوصیات کی وجہ سے نندنی اپنے اخباری ساتھیوں کے درمیان بہت مقبول تھی۔ اس کے ایک ساتھی کے الفاظ میں نندنی کی زندگی کا نظریہ یہ تھا:

She loved life to the full and wanted to live it to the full

وہ زندگی سے آخری حد تک پیار کرتی تھی اور زندگی کے ساتھ آخری حد تک رہنا چاہتی تھی۔

نندنی کی وفات پر اس کے ساتھی رپورٹروں نے ایک یادداشت (ہندستان ٹائمس ۱۷ ستمبر ۱۹۸۱) شائع کی ہے۔ اس یادداشت کے خاتمہ پر وہ لکھتے ہیں ——— نندنی کی موت اس حقیقت کی ایک بے رحم یاد دہانی ہے کہ ہر آدمی کا ایک بے حد مقرر وقت ہے:

It is a cruel reminder of the fact that there is a deadline for everyone.

کیسی عجیب بات ہے۔ ایک جیتی جاگتی زندگی اچانک بجھ جاتی ہے۔ ایک ہنستا ہوا چہرہ ایک لمحہ میں اس طرح ختم ہوجاتا ہے جیسے کہ وہ مٹی سے بھی زیادہ بے قیمت تھا۔ حوصلوں اور تمناؤں سے بھری ہوئی ایک روح دفعۃً اس طرح منظر سے ہٹا دی جاتی ہے جیسے اس کے حوصلوں اور تمناؤں کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

زندگی کس قدر بامعنی ہے۔ مگر اس کا انجام اس کو کس قدر بے معنی بنا دیتا ہے۔ آدمی بظاہر کتنا آزاد ہے مگر موت کے سامنے وہ کتنا مجبور نظر آتا ہے۔ انسان اپنی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنا زیادہ عزیز رکھتا ہے، مگر قدرت کا فیصلہ اس کی خواہشوں اور تمناؤں کو کتنی بے رحمی سے کچل دیتا ہے۔

آدمی اگر صرف اپنی موت کو یاد رکھے تو وہ کبھی سرکشی نہ کرے۔ کامیاب اجتماعی زندگی کا واحد راز یہ ہے کہ آدمی اپنی حد کے اندر رہنے پر راضی ہوجائے اور موت بلاشبہ اس حقیقت کی سب سے بہتر معلم ہے۔

جب گاڑی پٹری سے اتر جائے

گاڑی چلنے کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ اپنی مقررہ سڑک پر چل رہی ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ وہ سڑک کے دائیں بائیں اتر کر کسی پگڈنڈی پر دوڑنے لگے۔ بظاہر گاڑی دونوں صورتوں میں چل رہی ہوگی۔ مگر گاڑی کا چلنا وہی چلنا ہے جب کہ وہ اپنی شاہراہ پر چل رہی ہو۔ اگر وہ شاہراہ کو چھوڑ کر ادھر ادھر کے راستوں پر چلنے لگے تو یہ چلنا نہیں بلکہ صرف بھٹکنا ہوگا۔ اور بھٹکنے والی گاڑی کبھی اپنے مسافروں کو منزل پر نہیں پہنچاتی۔

ایسا ہی کچھ معاملہ دین کا ہے۔ دین کی بھی ایک شاہراہ ہے۔ اور اسی کے ساتھ شاہراہ کے دائیں بائیں بہت سی پگڈنڈیاں ہیں۔ دین کی گاڑی اگر اپنی شاہراہ سے اتر کر ادھر ادھر کے راستوں پر دوڑنے لگے تو بظاہر یہ بھی دینی سفر نظر آئے گا۔ مگر حقیقت کے اعتبار سے وہ بھٹکنا ہوگا۔ کیونکہ دینی سفر کا مقصد اپنے آپ کو خدا تک پہنچانا ہے اور خدا کسی آدمی کو شاہراہ پر ملتا ہے نہ کہ ادھر ادھر کی پگڈنڈیوں پر۔

موجودہ زمانہ میں بہت بڑے پیمانہ پر دینی سرگرمیاں وجود میں آئی ہیں۔ مگر اکثر سرگرمیاں اطراف کے راستوں پر بھٹکنے والی سرگرمیاں ہیں نہ کہ شاہراہ ہدایت پر چلنے والی سرگرمیاں۔

ان سرگرمیوں میں سے کوئی ہے جس نے اسلام کی دعوت کو جنت کی بشارت کی بنیاد پر اٹھا رکھا ہے حالانکہ صحیح اسلامی دعوت وہ ہے جو جہنم سے ڈرانے کی بنیاد پر اٹھے۔ کوئی اسلام کے نام پر احتساب اغیار کا جھنڈا اٹھائے ہوئے ہے حالاں کہ اسلام کا اصل رخ ہمیشہ احتساب خویش ہوتا ہے۔ کوئی ہے جس نے دین کی جزئیات کو اپنا مرکز و محور بنا رکھا ہے حالاں کہ دین کا مرکز و محور کلیاتی مسائل ہیں نہ کہ جزئیاتی مسائل۔ کوئی ملت کو دنیوی یا مادی مصائب سے بچانے کے نام پر اسلامی جہاد میں مصروف ہے۔ حالانکہ اسلامی جہاد صرف وہ ہے جو لوگوں کو آخرت کے مصائب سے بچانے کے لئے کیا جائے۔ کسی نے کسی "ظالم" اور کسی "کافر" کو ختم کرنے کے لئے ہنگامہ جاری رکھا ہے حالانکہ اسلام کی مہم وہ ہے جو ظلم اور کفر کے خلاف اٹھے نہ کہ ظالم اور کافر کے خلاف۔

جب چلتی ہوئی گاڑی پٹری سے اتر جائے تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ مگر دین کی گاڑی ہر ایک پٹری سے اتار کر دوڑا رہا ہے اور کسی کو اس کے ہولناک انجام کا احساس نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عام گاڑی کے پٹری سے اترنے کا انجام فوراً سامنے آجاتا ہے اور دین کی گاڑی کو پٹری سے اتار کر دوڑانے کا انجام موت کے بعد آدمی کے سامنے آئے گا۔

عمل کے بغیر

آج کاغذ کی اتنی افراط ہے کہ جہاں بھی دیکھیں کاغذ کا ایک ٹکڑا پڑا ہوا ملے گا۔ مگر کاغذ کے ان ٹکڑوں کی کوئی قیمت نہیں۔ نوٹ بھی کاغذ کا ایک ٹکڑا ہے۔ مگر اس کی قیمت ہے۔ اس کی قیمت اتنی یقینی ہے کہ کوئی بھی آدمی اس پر شبہ نہیں کرتا۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ عام کاغذی ٹکڑے کی کسی نے ضمانت نہیں لی ہے جبکہ نوٹ کے پیچھے سرکاری بینک کی ضمانت ہے۔ ہر نوٹ پر سرکاری بینک کی یہ ضمانت ثبت ہوتی ہے کہ وہ اس کے پیش کرنے والے کو وہ رقم پوری پوری ادا کر دے گا جو اس پر چھپی ہوئی ہے۔ یہی ضمانت ہے جس نے نوٹ کے کاغذ کو لوگوں کے لئے قیمتی بنا دیا ہے۔

یہی معاملہ الفاظ کا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ آج جتنے الفاظ بولے جا رہے ہیں تاریخ کے کسی دور میں اتنے الفاظ نہیں بولے گئے۔ مگر ان الفاظ کی کوئی قیمت نہیں، کیونکہ ان کے پیچھے اٹل ارادہ کی ضمانت شامل نہیں ہے۔ آپ سے ایک شخص وعدہ کرتا ہے کہ وہ آپ کا فلاں کام کر دے گا۔ مگر جب آپ مقررہ وقت پر اس کی حمایت مانگتے ہیں تو وہ بہانہ کر دیتا ہے۔ آپ مذکورہ شخص کے پاس جو چیز لے کر گئے وہ اس کے بولے ہوئے الفاظ تھے۔ جب اس نے اپنا وعدہ پورا نہیں کیا تو گویا اس نے اپنے الفاظ کی قیمت ادا نہیں کی۔ اس نے الفاظ کا کاغذ تو دے دیا مگر جو عمل اس کاغذ کی قیمت تھا اس کو دینے کے لئے تیار نہ ہوا۔ اس کے بولے ہوئے الفاظ ردی کاغذ کے ٹکڑے تھے نہ کہ بینک کا جاری کیا ہوا نوٹ۔

آج کی دنیا کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ الفاظ کی سطح پر ہر آدمی بڑے بڑے الفاظ بول رہا ہے مگر اپنے الفاظ کی عملی قیمت دینے کے لئے کوئی شخص تیار نہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں کے بولے ہوئے الفاظ اسی طرح ردی کے پرزے بن کر رہ گئے ہیں جیسے پرزے گلی کوچوں میں ہر وقت پڑے رہتے ہیں اور ہر آدمی ان کو بے قیمت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا ہے۔

ایک شخص مظلوموں کی حمایت میں بیانات اور تجویزوں کے انبار لگا رہا ہے مگر جب اس کے قریب کا ایک شخص اس کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ میری مظلومیت پر میری مدد کرو تو وہ اس کو برف کی طرح بالکل سرد پاتا ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ آدمی جو لفظ بول رہا تھا اس کے پیچھے اس کا حقیقی ارادہ شامل نہ تھا۔ وہ محض زبانی الفاظ تھے نہ کہ کوئی حقیقی فیصلہ۔ ایک شخص لوگوں کے سامنے شرافت اور تواضع کی تصویر بنا رہتا ہے مگر جب اس کی انا پر چوٹ لگتی ہے تو اچانک وہ حسد اور گھمنڈ کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کی شرافت محض ظاہری تھی، وہ اس کی روح میں اتری ہوئی نہ تھی۔

زندگی کا اسٹیج

حیدر آباد کا واقعہ ہے۔ ۲۱ ستمبر ۱۹۸۱ کو مسٹر بی کے رامار یڈی (۹۰ سال) اور ان کی ۸۰ سالہ بیوی پھولا بائی رات کے وقت اپنے گھر واقع بنجارہ ہلز میں سو رہے تھے۔ ان کے علاوہ ان کے گھر میں اس وقت صرف ان کا ملازم رامیا (۵۰ سال) تھا۔ رامیا نے عین نیند کی حالت میں کلہاڑی سے بوڑھے میاں بیوی پر حملہ کیا اور نہایت بے دردی کے ساتھ دونوں کو مار ڈالا۔ اس کے بعد رامیا نے بکس سے تقریباً ایک لاکھ روپے کے ہیرے اور زیورات نکالے اور رات کی تاریکی میں گھر سے باہر نکل گیا۔

راستہ چلتے ہوئے وہ ایک ایسے مقام پر پہنچا جہاں پولس کے دو آدمی رات کی ڈیوٹی میں پہرہ دے رہے تھے۔ ان کو شبہ ہوا چنانچہ انھوں نے رامیا کو پکڑ لیا۔ پوچھ گچھ اور ڈرانے دھمکانے کے بعد اس نے اپنے جرم کا اقرار کر لیا اور چرایا ہوا مال پولس کے حوالے کر دیا۔ دونوں پولس کے آدمیوں نے رامیا کو اور اس سے برآمد شدہ مال کو لے جا کر تھانہ میں جمع کر دیا۔ ان کا نام شیخ محبوب اور ایس ایم رشید بتایا گیا ہے۔

محکمہ پولس کے افسران کے علم میں یہ واقعہ آیا تو وہ شیخ محبوب اور ایس ایم رشید کی کارکردگی اور دیانت داری سے بہت خوش ہوئے اس کے بعد دونوں کو نقد انعامات دئے گئے اور اسی کے ساتھ دونوں کو ترقی بھی دے دی گئی۔ شیخ محبوب کو اسٹیشن آفیسر کے عہدہ پر متعین کر دیا گیا اور ایس ایم رشید کو ہیڈ کانسٹبل بنا دیا گیا۔

یہ ایک مثال ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کس طرح ایک واقعہ بیک وقت دو آدمیوں کے لئے دو معنی کا حامل ہوتا ہے۔ ایک واقعہ پیش آتا ہے مگر اسی ایک واقعہ سے ایک شخص کو کریڈٹ دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ڈسکریڈٹ کیا جاتا ہے۔ ایک شخص کو قاتل ثابت کر کے مجرم کے خانہ میں ڈال دیا جاتا ہے اور دوسرے شخص کو ایماندار اور فرض شناس ظاہر کر کے انعام کا مستحق بنا دیا جاتا ہے۔

دنیا میں جتنے واقعات پیش آتے ہیں سب کی نوعیت یہی ہے۔ یہاں کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں۔ یہاں کوئی شخص کسی کو نہ فائدہ پہنچا سکتا اور نہ نقصان۔ نہ کوئی کسی کو زندگی دے سکتا اور نہ موت۔ تاہم یہ سارے واقعات یہاں ایک یا دوسرے کے ہاتھ سے پیش آتے ہیں۔ دنیا ایک قسم کا خدائی اسٹیج ہے۔ یہاں مختلف حالات پیدا کر کے خدا ہر ایک کو یہ موقع دیتا ہے کہ اس کے اندر جو کچھ ہے اس کو وہ علی الاعلان ظاہر کر دے۔ جو شخص مجرمانہ ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات پا کر جرم کرے اور خدا کے قانون کے مطابق سزا کا مستحق ہو۔ جو شخص اپنے اندر حق پرستی کا ذہن لئے ہوئے ہے وہ اپنے موافق حالات میں حق اور انصاف کا معاملہ کرے تاکہ وہ خدا کے یہاں انعام اور قدر افزائی کے لائق ٹھہرے۔

ظاہر فریبی

ایر مارشل عبداللطیف ہوائی جہاز چلانے کا چالیس سالہ تجربہ رکھتے ہیں۔ ۲۵ اگست ۱۹۸۱ کو انھوں نے روسی ساخت کا آواز سے تیز چلنے والا لڑاکا جہاز مگ ۲۵ آزمائشی طور پر اڑایا۔ آدھ گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد انھوں نے جہاز کو نیچے اتارا۔ ایر مارشل جب ہوائی جہاز سے باہر آئے تو انھوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا:

The flight made even the Himalayas look small

ہماری پرواز کے سامنے ہمالیہ پہاڑ بھی چھوٹا دکھائی دیتا تھا (ٹائمس آف انڈیا ۲۶ اگست ۱۹۸۱)

آواز سے تیز رفتار جہاز ہمالیہ کے اوپر اڑانیں بھر رہا ہو تو اس وقت جہاز کے اوپر بیٹھے ہوئے آدمی کو ہمالیہ واقعی حقیر دکھائی دیتا ہے، اور اپنی عظمت کا ایک عجیب احساس پیدا کرتا ہے مگر یہ غلط فہمی اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب کہ جہاز ہمالیہ کی کسی چوٹی سے ٹکرا جائے۔ چٹان کے معمولی ٹکراؤ سے بھی فی الفور جہاز میں آگ لگ جاتی ہے اور اچانک جہاز اور اس کا مسافر دونوں اس طرح راکھ کا ڈھیر بن جاتے ہیں جیسے کہ ان کی کوئی حقیقت ہی نہ تھی۔

موجودہ دنیا میں کسی کو کوئی بڑائی ملتی ہے تو وہ بہت جلد غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ حالاں کہ دنیا کی ہر بڑائی ایسی ہی ہے جیسے تیز رفتار ہوائی جہاز کے اوپر سے کسی آدمی کا پہاڑ کو دیکھنا۔ ایسے مسافر کو بظاہر اپنی سواری عظیم معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایک خیالی فریب کے سوا اور کچھ نہیں۔ حالات کا معمولی فرق بھی اس کو یہ بتانے کے لئے کافی ہو جاتا ہے کہ اس کی کوئی حقیقت نہ تھی۔

دنیا میں کسی چیز کو پانے کے لئے جن بے شمار اسباب کی موافقت ضروری ہے ان کی فراہمی کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ یہ صرف خدا ہے جو تمام موافق اسباب کو یکجا کر کے کسی واقعہ کو ظہور میں لاتا ہے۔ تاہم اس سارے معاملہ پر ظاہری اسباب کا پردہ ڈال دیا گیا ہے۔ آدمی سے یہ مطلوب ہے کہ وہ حقیقت پسندی کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے خدا کی خدائی اور اس کے مقابلہ میں اپنی بندگی کا اعتراف کرلے۔ وہ بظاہر اپنی کوششوں سے پائے مگر اس کو خدا کی طرف سے آیا ہوا سمجھے۔ وہ بظاہر بڑا بنا ہوا ہو مگر اپنے کو چھوٹا یقین کرے۔ وہ بظاہر بلندی پر اڑ رہا ہو مگر اپنے کو پستی میں اترا ہوا محسوس کرے۔

آدمی کا امتحان یہ ہے کہ وہ ظاہری فریب سے گزر کر اصل حقیقت کو پائے، یہاں کی ہر بڑائی کو جھوٹی بڑائی سمجھے۔ مگر بہت کم لوگ ہیں جو اس فریب کا پردہ پھاڑنے میں کامیاب ہوتے ہوں۔

ضمیر کے خلاف

مشہور انگریز مورخ آرنلڈ ٹائن بی (۱۹۷۵ـ ۱۸۸۹) نے اپنی آخر عمر میں ایک بار کہا کہ فلسطین پر یہودیوں کا بطور تاریخی وطن اپنا حق جتانا ایسا ہی ہے جیسے ریڈ انڈین قبائل کناڈا کی واپسی کا مطالبہ کریں۔ یہودیوں نے نازیوں کے ظلم پر بے شمار کتابیں لکھی ہیں مگر خود یہودی فلسطینی عربوں کے ساتھ جو وحشیانہ سلوک کر رہے ہیں وہ بالکل اسی قسم کا ہے جو نازیوں نے یہودیوں کے ساتھ کیا تھا۔

ٹائن بی نے اپنا یہ بیان کناڈا میں دیا تھا۔ اس وقت کناڈا میں حکومت اسرائیل کے سفیر مسٹر ہرزگ تھے۔ مسٹر ہرزگ نے برطانی مورخ کو دعوت دی کہ اس مسئلہ پر وہ اس سے مباحثہ کریں۔ آرنلڈ ٹائن بی نے اس کو قبول کر لیا۔ اس کے بعد مانٹریل کی میک گل یونیورسٹی میں ایک تقریب ہوئی جس میں دونوں جمع ہوئے۔ مسٹر ہرزگ نے کہا: جرمن نازیوں نے ساٹھ لاکھ یہودیوں کو مار ڈالا تھا۔ اس کے مقابلہ میں فلسطین میں جو عرب بے گھر ہوئے ہیں ان کی تعداد بہت معمولی ہے۔ ان دونوں کو ایک جیسا کس طرح کہا جا سکتا ہے۔

آرنلڈ ٹائن بی نے جواب دیا کہ میں نے جب نازیوں اور اسرائیلیوں کے مظالم کو ایک جیسا کہا تھا تو اس سے مراد تعداد نہیں بلکہ جرم کی نوعیت تھی۔ کسی شخص کے لئے سو فی صد سے زیادہ برا ہونا ممکن نہیں۔ قاتل کہلانے کے لئے ایک شخص کو قتل کر دینا کافی ہے۔ میں حیران ہوں کہ آپ لوگ میرے الفاظ پر کیوں اس قدر بوکھلا اٹھے ہیں۔ میں نے وہی بات کہی ہے جو تم میں سے ہر ایک کا ضمیر کہہ رہا ہے۔

جب بھی آدمی کسی سچائی کی تردید کرتا ہے تو سب سے پہلے وہ خود اپنی تردید کر رہا ہوتا ہے۔ سچائی ہمیشہ آدمی کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے مگر آدمی ضد، تعصب اور اپنی چھوٹی بڑائی کو قائم رکھنے کی خاطر اس کو نہیں مانتا، وہ اپنے انکار کو حق بجانب ثابت کرنے کے لئے ایسے الفاظ بولتا ہے جن کے بارے میں خود اس کا دل گواہی دے رہا ہوتا ہے کہ ان میں کوئی وزن نہیں۔

آدمی کی سب سے بڑی محرومی یہ ہے کہ وہ اپنے ضمیر کا ساتھ نہ دے سکے۔ ضد اور تعصب اور مصلحت سے مغلوب ہو کر وہ ایسے رخ پر چلنے لگے جس کے متعلق اس کا اندرونی ضمیر آواز دے رہا ہو کہ وہ صحیح رخ نہیں ہے۔ یہ اپنی تردید آپ کرنا ہے یہ اپنے آپ کو خود اپنے ہاتھوں قتل کرنا ہے۔ یہ اپنے مجرم ہونے پر خود گواہ بننا ہے۔

کیسی عجیب ہے یہ محرومی۔ مگر جب آدمی کی بے حسی بڑھ جاتی ہے تو وہ اپنی محرومی کی ان کارروائیوں کو اپنی فتح سمجھتا ہے۔ وہ اپنے کو ہلاک کر رہا ہوتا ہے مگر سمجھتا ہے کہ میں اپنے آپ کو زندگی دے رہا ہوں۔

نفسیات کا دخل

جدید مغربی فکر یہ ہے کہ انسان اور دوسرے تمام حیوانات ارتقائی عمل کے ذریعہ وجود میں آئے ہیں۔ انیسویں صدی میں اس سلسلے میں مغرب کے سامنے دو مختلف نظریات آئے۔ ایک وہ جس کو فرانسیسی عالم لامارک (۱۸۲۹ - ۱۷۴۴) نے پیش کیا تھا۔ دوسرا وہ جس کو انگریزی عالم ڈارون (۱۸۸۲ — ۱۸۰۹) کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ مغرب میں ڈارون کے نظریہ کو زبردست مقبولیت حاصل ہوئی۔ اور اس کے مقابلہ میں لامارک کے نظریہ کو ناقابل لحاظ سمجھ کر چھوڑ دیا گیا۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ لامارک کے نظریہ کے مقابلہ میں ڈارون کا نظریہ زیادہ طاقت ور یا زیادہ ثابت شدہ تھا۔ اس کی وجہ زیادہ تر نفسیاتی تھی۔ ڈارون کے نظریہ میں انیسویں صدی کے مغربی انسان کو نفسیاتی ملتی تھی جو جدید قوتوں سے مسلح ہو کر سارے عالم کو اپنی نوآبادی بنا دینا چاہتا تھا، جب کہ لامارک کے نظریہ میں یہ نفسیاتی تسکین موجود نہ تھی۔

لامارک اور ڈارون دونوں زندگی کو ایک ارتقائی واقعہ مانتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ لامارک کا زور زیادہ تر وراثتی اوصاف پر ہے اور ڈارون کا زور تنازع للبقاء کے درمیان انتخاب فطری پر۔ یعنی لامارک کے نزدیک کسی ابتدائی نوع سے زیادہ ترقی یافتہ نوع اس طرح بنتی ہے کہ ایک فرد کے اکتسابی اوصاف وراثتی طور پر اگلی نسل کو منتقل ہوتے ہیں۔ یہ انتقال نسل در نسل عرصہ دراز تک جاری رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ایک نوع بالآخر دوسری نوع کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ دوسری طرف ڈارون کے مطابق یہ ہوتا ہے کہ ایک حیوان کے کئی بچوں میں سے ایک بچہ پیدائشی طور پر کسی خصوصیت میں دوسروں سے زیادہ ہوتا ہے۔ بقائے حیات کی جدوجہد میں یہ اضافی خصوصیت والا حیوان باقی رہتا ہے اور دوسرے حیوانات ختم ہو جاتے ہیں۔ اس کی یہ اضافی خصوصیت توالد و تناسل کے ذریعہ اگلی نسلوں میں منتقل ہوتی ہے۔ اس طرح بقائے حیات کی جدوجہد کے دوران زیادہ صالح کا انتخاب ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ یہ صالحیت نسل در نسل جمع ہوتے ہوتے ایک بالکل نئی نوع میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

نظریات میں اکثر اوقات نفسیات کا دخل ہوتا ہے۔ آدمی ایک چیز کو اختیار کرتا ہے اور اس کو منطقی صداقت کے طور پر پیش کرتا ہے۔ حالاں کہ یہ محض اپنی برائی پر پردہ ڈالنے کی ایک کوشش ہوتی ہے۔ اس نے اپنی خواہش کے تحت ایک چیز کو چھوڑا اور دوسری چیز کو لے لیا۔ مگر جب اس کی تشریح کرنے کا وقت آیا تو اس انداز میں اس کی تشریح کرنے لگا گویا کہ اس کو حق پا کر اس نے اسے اختیار کیا تھا۔

امتحان کا مقام

کالج میں امتحان ہو رہا تھا۔ ایک طالب علم امتحان ہال میں داخل ہوا۔ مگر اس نے امتحان کی کاپی پر کچھ نہیں لکھا۔ وہ بس بیٹھا ہوا سگریٹ پیتا رہا اور تین گھنٹہ گزار کر باہر چلا آیا۔ اس کے بعد وہ لائبریری پہنچا اور وہاں کتابوں کے درمیان بیٹھ کر پرچہ حل کرنا شروع کر دیا۔ امتحان ہال میں اس نے اپنی کاپی سادہ چھوڑ دی تھی مگر لائبریری میں اس نے اپنی کاپی بھر ڈالی۔

آپ کہیں گے کہ یہ فرضی کہانی ہے۔ کوئی طالب علم اتنا بے وقوف نہیں ہو سکتا کہ امتحان ہال میں پرچہ حل نہ کرے اور لائبریری میں بیٹھ کر کاپی بھرنے لگے۔ اور اگر یہ واقعہ سچا ہو تو یقیناً وہ کوئی ایسا طالب علم ہو گا جس کا دماغ صحیح نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ اس قسم کی حرکت کوئی پاگل طالب علم ہی کر سکتا ہے۔ مگر دنیا کے امتحان کے معاملہ میں جو بات لوگوں کو اتنی عجیب معلوم ہوتی ہے، آخرت کے معاملہ میں ہر شخص اسی طریقہ پر عمل کر رہا ہے۔ کالج کے ذمہ دار طلبہ کا امتحان جہاں لینا چاہتے ہیں وہ امتحان ہال ہے نہ کہ لائبریری۔ اسی طرح خدا کے بھی امتحان لینے کے مقامات ہیں۔ مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ خدا نے امتحان کے جو مقامات مقرر کئے ہیں وہاں لوگ امتحان میں پورا اترنے کی کوشش نہیں کرتے۔ اس کے بجائے وہ دوسرے دوسرے مقامات پر خدا پرستی اور دین داری کا کمال دکھا رہے ہیں۔

خدا آدمی کے ایمان کا ثبوت دل کی انابت میں دیکھنا چاہتا ہے اور لوگ اپنے ایمان کا ثبوت کلمۂ ایمان کے مخارج میں دے رہے ہیں۔ خدا آدمی کی عبادت کو خشوع کے معیار پر جانچ رہا ہے اور لوگ مسائل کی پابندی میں اپنی عبادت گزاری کا ثبوت فراہم کر رہے ہیں۔ خدا لوگوں کے دین کو کردار اور معاملات کی سطح پر جانچ رہا ہے اور لوگ اشراق اور چاشت کے فضائل میں اپنی دین داری کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ خدا چاہتا ہے کہ آدمی اپنے آپ پر خدا کی حکومت قائم کرنے والا بنے اور لوگ کسی خارجی شخص کے خلاف اکھیڑ پچھاڑ کر کے حکومت خداوندی کے قیام کا کریڈٹ لینے میں مصروف ہیں۔ خدا کسی آدمی کو جہاں مظلوموں کی حمایت کرنے والا دیکھنا چاہتا ہے وہ مظلوم فرد ہے مگر لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ ظلم و فساد کے اجتماعی واقعات پر تقریریں اور بیانات پیش کر کے اپنے کو مظلوموں کا حامی ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہوئے ہیں۔

ہر آدمی جانتا ہے کہ کسی طالب کی وہ کاپی بالکل بے کار ہے جو امتحان ہال کے بجائے لائبریری میں بیٹھ کر بھری گئی ہو۔ کاش لوگ جانتے کہ ٹھیک اسی طرح وہ عمل بے حیثیت ہے جو خدا کے مطلوبہ مقام کے علاوہ کہیں اور پیش کیا گیا ہو۔

اسلامی تخریب کاری

ایک خبر پڑھئے: نائجیریا کی احمدو بیلو یونیورسٹی کے کانفرنس ہال میں عرصہ سے شراب کی ایک کینٹین قائم تھی۔ یونیورسٹی کے "اسلام پسند" طلبہ اس کو ہٹانے کا مطالبہ کر رہے تھے۔ مگر انتظامیہ اس کو نہیں مان رہی تھی۔ معاملہ اسی طرح ٹلتا رہا۔ یہاں تک کہ لڑکوں نے نوٹس دے دیا کہ شراب خانہ اگر ہال سے ہٹایا نہیں گیا تو وہ اس کو توڑ ڈالیں گے۔ یونیورسٹی کے حکام نے اس کے جواب میں کہا کہ جو لوگ ایسا کریں گے ان کو سخت نتائج کا سامنا کرنا پڑے گا۔ طلبہ اور انتظامیہ کی یہ کش مکش بالآخر ۵ مئی ۱۹۸۱ کو بھڑک اٹھی۔ طلبہ نے دھاوا بول کر شراب خانہ کو توڑ دیا۔ اس کے بعد انتظامیہ نے اس تخریبی کارروائی میں ملوث ۲۴ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس کے بعد اور آگ بھڑکی۔ طلبہ نے یونیورسٹی حکام کے "غیر اخلاقی رویہ" کے خلاف احتجاجی مظاہرہ کیا۔ یونیورسٹی کے در و دیوار کو اسلامی نعروں سے بھر دیا۔ اس واقعہ کے بعد یونیورسٹی کی دو طالبات نے قومی ترانہ میں شرکت سے انکار کر دیا۔ کیونکہ ان کے مطابق قومی ترانہ میں "خدا پرستی کے بجائے قوم پرستی کا ذکر ہے"۔ اب حکومت نے مزید ۳۷ طلبہ کو گرفتار کر لیا۔ اس ہنگامہ آرائی میں ہزاروں طلبہ کا تعلیمی نقصان ہوا اور مسئلہ بدستور اپنی جگہ باقی رہا۔ (۷ اگست ۱۹۸۱)

عرب کے لوگ شراب پیتے تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سالوں تک ان کو سمجھاتے رہے اور ان کے دل کو نرم کرتے رہے تاکہ وہ شراب کی برائی کو سمجھ جائیں اور خود اپنے ہاتھ سے شراب کے مٹکے توڑ ڈالیں۔ آج ان کے ماننے والے ان کے نام پر تخریب کاری کے ذریعہ شراب کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے تضاد کے باوجود وہ سمجھتے ہیں کہ وہ عین اسلام پر عمل کر رہے ہیں۔

لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ "شراب پینے والوں" کے پاس ایک دن بھی اس جذبہ سے نہیں گئے کہ ان کو دل سوزی اور خیر خواہی کے انداز میں سمجھائیں۔ ان کی ایک رات کی نیند بھی ان کے حق میں دعائیں کرنے میں خراب نہیں ہوئی۔ انھوں نے ایک بار بھی اس بات کا ثبوت نہیں دیا کہ وہ فی الواقع اپنے بھائیوں کی گمراہی پر تڑپ رہے ہیں اور ان کے برے انجام کے غم میں ان کا یہ حال ہو رہا ہے گویا کہ وہ خود اپنے آپ کو ہلاک کر ڈالیں گے۔ ان کا سارا شوق بس یہ ہے کہ لوگوں کے اوپر خدائی فوجدار بن کر کھڑے ہو جائیں۔ وہ خدا کی نظر میں داعی اور مصلح بننا چاہتے ہیں حالانکہ انھوں نے ایک دن بھی دعوت اور اصلاح کا عمل نہیں کیا۔

اس قسم کی اسلامی تخریب کاری آج بہت بڑے پیمانہ پر مسلم دنیا میں جاری ہے۔ مگر ان چیزوں کا کوئی بھی تعلق اسلام سے نہیں۔ یہ سراسر لیڈری ہے۔ کچھ لوگ اس نام پر لیڈری کے ہنگامے برپا کئے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ اُس نام پر۔ کچھ لوگ ایک عنوان پر اپنے حریف کو نیچا دکھانے میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ لوگ دوسرے عنوان پر۔ جو لوگ اس تخریبی سیاست میں مصروف ہیں وہ بلاشبہ مجرم ہیں اور جو لوگ اس تخریب کاری کے حق میں اسلامی جواز پیش کر رہے ہیں وہ مجرموں کے لیڈر۔

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا۔ بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ ۱۳۵ روپے یا ماہانہ ۱۱ روپیہ ۲۵ پیسے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

ثانی ثنین خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

مجرب نسخے

گھر کا ڈاکٹر — صفحات ۳۰۴ — قیمت مجلد بارہ روپے (علاوہ محصول ڈاک)
مخزن خاندانی تجربات — صفحات ۳۰۴ — قیمت بارہ روپے "
مخزن آسان علاج — صفحات ۲۷۲ — قیمت دس روپے "

مصنفہ ڈاکٹر سی آر تنیجہ گولڈ میڈلسٹ

پتہ

بھارت دواخانہ ارجن نگر گوڑ گاؤں (ہریانہ)

دین کی سیاسی تعبیر

(خلاصہ: تعبیر کی غلطی)

مولانا وحید الدین خاں

قیمت
دو روپیہ
(زیادہ خریداری پر خصوصی کمیشن)

تنقید کی اہمیت دین میں
غلطی کی جدید نوعیت
یہ دین کی سیاسی تعبیر ہے
زیر تبصرہ لٹریچر اپنے اقتباسات کی روشنی میں
آیات و احادیث سے غلط استدلال
تعبیر کی غلطی کے اثرات بہت دور تک جاتے ہیں
حقیقت کا اعتراف کیجئے
ذہنیت آدمی کی رائے پر اثر انداز ہوتی ہے

مکتبہ الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دہلی ۶

کیا
آپ کی روزانہ کی خوراک سے
آپ کے بدن کو پوری قوّت اور
پورا فائدہ مِلتا ہے؟

اپنی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ حاصل کرنا اِس بات پر منحصر ہے کہ آپ کا نظامِ ہضم کتنا ٹھیک اور طاقتور ہے۔

سنکارا ہی ایک ایسا ٹانک ہے جس میں طاقت دینے والے ضروری وٹامنوں اور معدنی اجزاء کے ساتھ چھوٹی الائچی، لونگ، دھنیا، دارچینی، تیزپات، تلسی وغیرہ جیسی چودہ ۱۴ جڑی بوٹیاں شامل ہیں۔ اِس مرکب سے آپ کے نظامِ ہضم کو طاقت ملتی ہے اور آپ کا بدن اس کی مدد سے آپ کی روزمرّہ خوراک سے صحیح تغذیہ اور بھرپور قوّت حاصِل کرتا ہے۔

سنکارا

ہر موسم اور ہر عمر میں
سب کے لیے بے مثال ٹانک

ہمدرد

HD-5949 AU

REGD. R. N. NO. 28822/76
REGD. NO. D. (DN) 532

ISSUE NO. 61
DECEMBER 1981

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

مولانا وحید الدین خاں کے قلم سے

۱- الاسلام	۰-۱۵
۲- مذہب اور جدید چیلنج	۰-۱۵
۳- ظہورِ اسلام	۰-۱۵
۴- دین کیا ہے؟	۰-۲
۵- قرآن کا مطلوب انسان	۰-۵
۶- تجدید دین	۰-۳
۷- اسلام دینِ فطرت	۰-۳
۸- تعمیرِ ملت	۰-۳
۹- تاریخ کا سبق	۰-۳
۱۰- مذہب اور سائنس	۰-۵
۱۱- عقلیاتِ اسلام	۰-۳
۱۲- فسادات کا مسئلہ	۰-۲
۱۳- انسان اپنے آپ کو پہچان	۰-۱
۱۴- تعارفِ اسلام	۰-۵۰
۱۵- اسلام پندرھویں صدی میں	۰-۲
۱۶- راہیں بند نہیں	۰-۳
۱۷- دینی تعلیم	۰-۳
۱۸- ایمانی طاقت	۰-۳
۱۹- اتحادِ ملت	۰-۳
۲۰- سبق آموز واقعات	زیر طبع
۲۱- اسلامی تاریخ سے	"
۲۲- قال اللہ	"
۲۳- اسلامی دعوت	۰-۳
۲۴- زلزلۂ قیامت	۰-۴
۲۵- سچا راستہ	۰-۱

مکتبہ الرسالہ - دہلی-۶